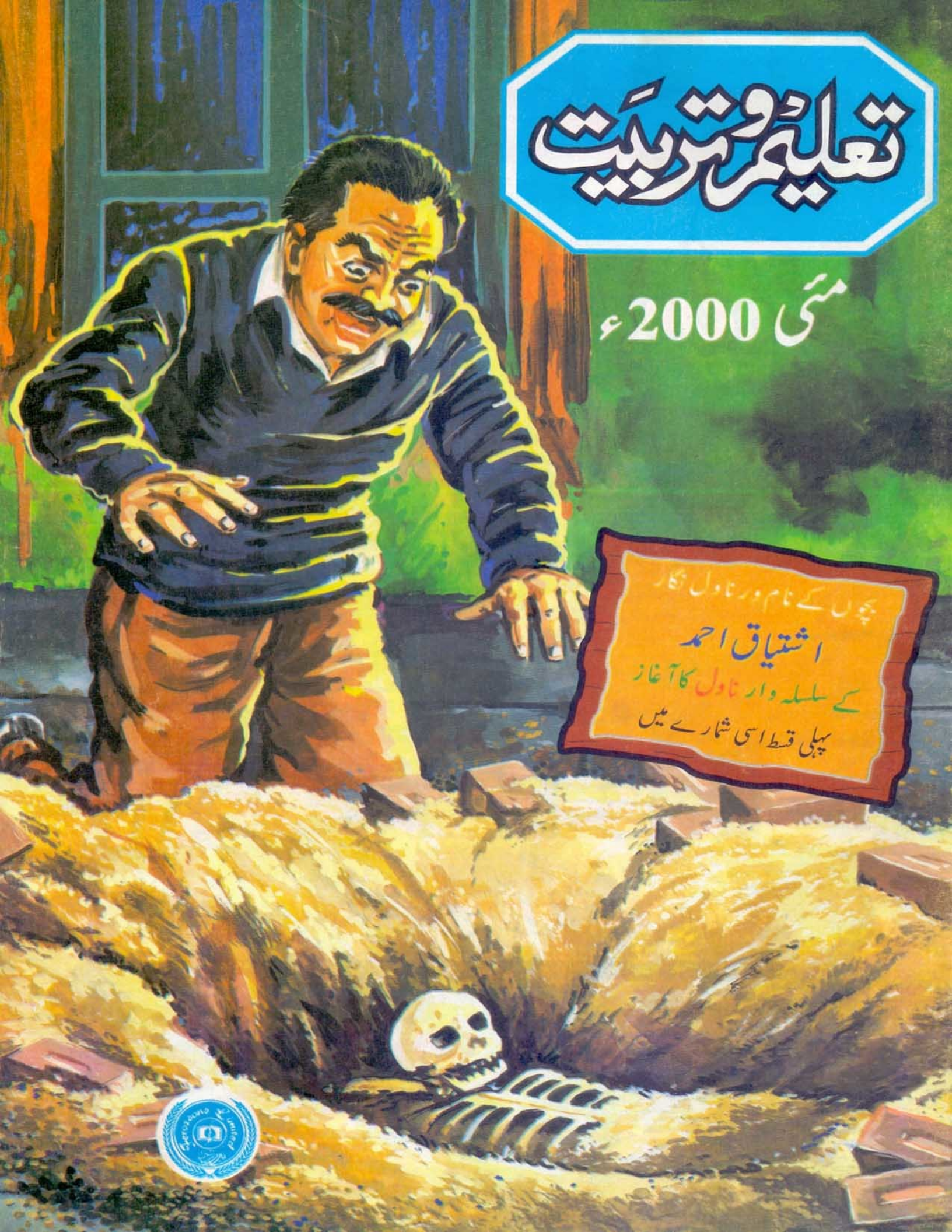
تعلیم و تربیت
مئی 2000ء
بچوں کے نام ور ناول نگار
اشتیاق احمد
کے سلسلہ وار ناول کا آغاز
پہلی قسط اسی شمارے میں

عظیم سفر نامہ

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے تمام سفروں کے دل چسپ واقعات

پیغمبر اعظم ﷺ کے تاریخی سفر

ڈاکٹر عبدالرؤف

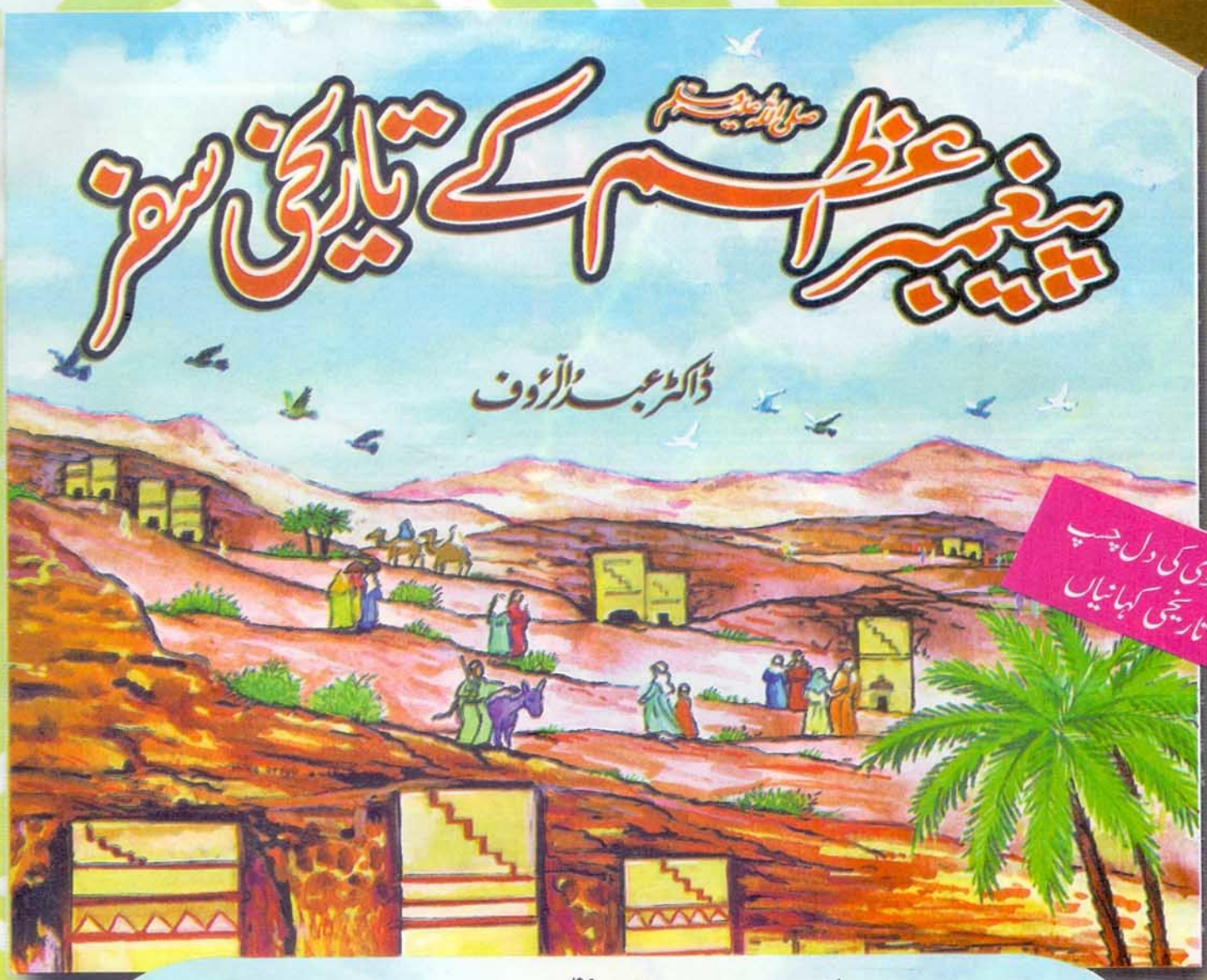

عہد نبوی کی دل چسپ تاریخی کہانیاں

ایک انوکھے شاہکار میں تین عظیم موضوعوں کا خلاصہ:

(1) عظیم نبوی ﷺ سفر نامہ (2) سیرت طیبہ (3) دل چسپ نبوی ﷺ کہانیاں

متعدد رنگین، قیمتی اور نادر تصویروں سے آراستہ

کتاب کا عالمی انگریزی اڈیشن بھی تیار ہے۔

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور راولپنڈی کراچی

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا 6واں ل سرا ارہ

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر: عبدالسلام | ایڈیٹر پبلشر: ظہیر سلام | مشیر: سعید لخت | سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر: رضوان ثاقب | خصوصی مشیر: محمود حسن رومی | آرٹسٹ ڈیزائننگ: شوکت اعجاز | سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

"ہیں؟" "جی ہاں!!

عرفان بھائی، امتحان بھی ختم ہوگئے اور گرمیوں کی چھٹیاں بھی ہونے والی ہیں۔
"تو پھر سائرہ باجی" ..... "پھر یہ کہ کوئی اچھا سا ناول ہونا چاہیے، فارغ وقت میں پڑھنے کے لیے"۔
"باجی، یہ دیکھیں تعلیم و تربیت نے ہماری اس خواہش کو بھی پورا کر دیا ہے۔ دل چسپ ناول کی پہلی قسط اسی شمارے میں شائع ہوئی ہے"۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

گرمیوں کے موسم کا آغاز ہو چکا ہے اور گرمی کافی زوروں کی پڑ رہی ہے۔ لو سے بچنے کے لیے دھوپ میں سر خوب اچھی طرح ڈھانپ کر نکلیں اور باہر نکلنے سے پہلے پانی ضرور پی لیں۔ اگلے ماہ آپ کو گرمیوں کی چھٹیاں ہو جائیں گی بہر حال اب جب اسکول سے واپس آئیں تو فوراً اے سی یا روم کولر کے آگے نہ بیٹھیں بلکہ تھوڑی دیر سانس لے لیں۔

آج سے دو سال پہلے یعنی 28 مئی 1998ء کو پاکستان کے نامور سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے چاغی کے مقام پر ایٹمی دھماکے کیے جس سے پوری قوم کا نہ صرف سر فخر سے بلند کر دیا بلکہ ملکی دفاع بھی ناقابل تسخیر بن گیا۔ آپ بھی اپنی تعلیم پر پوری توجہ دیتے ہوئے پختہ ارادہ کریں کہ بڑے ہو کر ایسے ہی کارہائے نمایاں انجام دیں گے جن سے پیارا وطن پاکستان آپ پر ناز کر سکے۔

لیجیے اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہو ہی گئی ہیں اور آپ کا پسندیدہ قسط وار ناول شروع کر دیا گیا ہے۔ اس کی پہلی قسط کو پڑھیے اور بتائیے کہ کیسا لگا۔ امید ہے آپ کو یہ ناول بہت پسند آئے گا..... بہت سارے ساتھیوں نے ہمیں امتحان میں اپنی کامیابی کی خبر سنائی ہے۔ ہماری طرف سے ان سب ساتھیوں کو دلی مبارک باد۔

مئی 2000ء

قیمت فی پرچہ: 15 روپے

(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

سرورق: گڑھے میں لاش

پرنٹر: عبدالسلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

اس شمارے میں

ہجری سال کی کہانی	فرحت جاوید	2
ماں کی دعا (سچی کہانی)	سید نظر زیدی	6
پانی (نظم)	اجمل وجیہہ	9
آپ کا خط ملا		10
نماز کی اہمیت (درس قرآن)	ڈاکٹر عبدالرؤف	13
چھپا رستم (سائنس فکشن)	حسن ذکی کاظمی	14
تین قیمتی موتی (سنی سنائی)	زبیدہ سلطانہ	24
چاچو چاند بنے جاسوس (کہانی)	محمد معروف چشتی	27
دل چسپ اور ناقابل یقین	عبدالستار خان طاہر	30
کرکٹ کیا اور کیسے؟ (قسط 7)	امین الطاف	34
مگرمچھ (جنگلی حیات)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	38
موذیوں کے درمیان (کہانی)	سلیم خان گمی	42
آیئے مسکرائیں (لطائف)		46
مزدور (نظم)	ضیغم حمیدی	47
غلے کا جہاز (کہانی)	نجمہ معراج	48
مجرم کون؟		51
ہونہار مصور		52
ضمانت (کہانی)	علی اکمل تصور	54
صادقین (روشن مینار)	سید شوکت اعجاز	60
گڑھے میں لاش (پہلی قسط)	اشتیاق احمد	64

باقی سب دل چسپ سلسلے حسب معمول

سالانہ قیمت: پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے
مشرق وسطیٰ افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/690 روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/770 روپے
امریکا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =/890 روپے

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس، لاہور
فون: 6278815 - 6278816 - 6361309 - 6361310

فرحت جاوید

ہجری سال کی کہانی

عیدالاضحیٰ کے اگلے روز ہی کرنل تیمور کی چھوٹی بیٹی بھی اپنے بچوں سمیت آگئیں اور یوں بچوں کی پارٹی میں دو اور گرم جوش ممبروں کا اضافہ ہو گیا۔ اسامہ اور ملائکہ' کرنل تیمور کے یہ دونوں نواسہ اور نواسی حد درجہ ذہین اور لائق ہیں۔ اسامہ ساتویں اور ننھی ملائکہ پانچویں جماعت کا امتحان دے کر آئے ہیں۔ گل ریز' تابندہ' شیرازہ' ذی شان' اسامہ اور ملائکہ پر مشتمل یہ بچہ پارٹی متفقہ طور پر "کھیل کے وقت کھیل اور پڑھائی کے وقت پڑھائی" کے سنہری اصول پر سختی سے کاربند تھی۔ بچے اپنی اپنی اگلی جماعت کے مطابق کچھ کتابیں ساتھ لائے ہوئے تھے اور روز کچھ وقت کرنل تیمور کی لائبریری میں جا کر ان کا مطالعہ کرتے تھے۔ کرنل تیمور نے گھر کی اوپر والی منزل میں ایک عمدہ لائبریری بنا رکھی ہے۔ جس میں طرح طرح کی کافی کتابیں موجود ہیں۔ کرنل تیمور عموماً سونے سے پہلے تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کرتے ہیں۔

آج بھی حسب معمول سارے بچے لائبریری میں پڑھ رہے تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ اسامہ نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف کرنل تیمور کے بڑے بیٹے تنویر احمد اسلام آباد سے بول رہے تھے۔ اسامہ نے بتایا کہ نانا ابو اور نانی امی بازار گئے ہیں۔ وہ فون پر کہہ رہے تھے "بچو! آپ سب کو مبارک ہو' حکومت پاکستان نے ابا جان کو ان کی سیرت کی کتاب پر ہجری ایوارڈ دیا ہے۔ دادی امی اور دادا ابو گھر آئیں تو انہیں یہ خوش خبری ضرور دے دینا"۔

فون سنتے ہی سب بچے خوشی سے اچھلنے لگے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ باہر ہارن کی آواز سن کر ذی شان اچھل پڑا "دادا ابو آگئے"۔ کرنل تیمور گاڑی سے اترے' بچے شرارت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے'

کرنل تیمور بھانپ گئے کہ کوئی بات چھپائی جا رہی ہے' ابھی وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ذی شان خوشی سے تالیاں بجانے لگا اور دادا ابو سے بولا "دادا ابو' آپ کا انعام! آپ فرسٹ آگئے ہیں"۔

سب بچے ننھے ذی شان کے اس جلد انکشاف پر سٹ پٹا کر رہ گئے اور پھر یک زبان ہو کر مبارک مبارک کے نعرے مارنے لگے۔ بیگم تیمور کو جب پتا چلا تو وہ بھی بہت خوش ہوئیں۔ کرنل تیمور آئس کا بڑا پیکٹ ساتھ لائے تھے۔ سب نے خوب مزے لے لے کر آئس کریم کھائی۔ اب سب گھیرا ڈالے بیٹھے تھے اور اصرار کر رہے تھے کہ دادا ابو آج کوئی پیاری سی کہانی سنائیں۔ چناں چہ طے یہ ہوا کہ وہ رات کے کھانے کے بعد کہانی سنائیں گے۔

مغرب کی نماز کے بعد جونہی سب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے' کہانی سننے کے شوق میں سب بچے کرنل تیمور کے گرد جمع ہو گئے۔ تابندہ جو کچھ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی' بولی "دادا ابو' ہجری کا ایوارڈ کیا ہوتا ہے؟"

کرنل تیمور مسکرائے اور کچھ سوچتے ہوئے بولے "بیٹا ہجری ایوارڈ ایک ایسا انعام ہے جو حکومت کی طرف سے پورے ہجری سال کے دوران میں سیرت النبیؐ پر لکھی گئی کتابوں پر دیا جاتا ہے۔ آپ سب جانتے ہی ہوں گے کہ اسلامی سال کو ہجری سال کہتے ہیں۔ ہمارے اسلامی کیلنڈر کی

ابتدا آنحضورؐ کی ہجرت مبارکہ سے ہوئی ہے۔ ہمارے دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے مبارک عہد میں اسلامی سال کی ابتدا کی۔ اس وقت سے لے کر آج تک اسلامی کیلنڈر اسی حساب سے چلا آرہا ہے۔ ہجری سال یکم محرم سے شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا یکم محرم سے سن ہجری 1421ھ کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیارے نبیؐ کو ہجرت فرمائے ہوئے 1420 سال ہو چکے ہیں۔ آنحضورؐ نے مکہ سے مدینہ کو جو ہجرت فرمائی وہ ایسا عظیم واقعہ ہے جس نے انسانی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ایک ایسی اسلامی مملکت کی بنیاد ڈالی گئی جو پوری دنیا میں امن و سلامتی کا ذریعہ بنی"۔

"اب بچو آپ کے لیے کہانی شروع!" کرنل تیمور نے پہلو بدلا اور گاؤ تکیے کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر بچوں کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے۔ وہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے اور توجہ سے کہانی سننے لگے۔

"آج سے سینکڑوں برس پہلے کی بات ہے، 12 ستمبر 622ء جمعرات کے دن، صبح سویرے ہی شہر کے تمام مشرک سردار ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور نہایت خفیہ طریقے سے صلاح مشورے کرنے لگے۔ کیوں کہ نیکی اور ہدایت کا سورج شہر مکہ میں طلوع ہو چکا تھا، اور اپنی کرنوں سے جہالت، گمراہی اور کفر کے اندھیرے دور کرنے لگا تھا مگر کفر و شرک میں مبتلا اہل قریش کے سرداروں کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ ہر وقت اللہ کے سچے نبی حضرت محمدؐ کی مخالفت پر کمربستہ رہتے تھے۔ ایک دن پیارے نبیؐ خانہ کعبہ میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے لگے تو کفار تلواریں لیے آپؐ پر جھپٹ پڑے۔ آپؐ کے پیارے ساتھی حضرت حارثؓ آگے بڑھے اور آنحضورؐ کا دفاع کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی جان قربان کر دی مگر اپنے آقا و رسولؐ پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔ آپ کو معلوم ہے اسلام کے پہلے شہید کون ہیں؟ یہی حضرت حارثؓ اسلام کے پہلے شہید ہیں۔

مکہ کے کافر اسلام دشمنی میں حد سے بڑھ چکے تھے۔ یہ بدبخت لوگ ہمارے پیارے نبیؐ کے راستے میں کانٹے بچھا دیتے تھے، آپؐ شہر کی گلیوں میں سے گزرتے تو آپؐ پر کوڑا کرکٹ پھینکتے، آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کا مذاق اڑاتے، کبھی آپؐ پر پتھر برساتے۔ گویا انہوں نے آنحضورؐ کو تنگ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

"میرے بچو" کرنل تیمور کہانی جاری رکھتے ہوئے بولے "یہ ظلم و ستم صرف حضورؐ کی ذات تک ہی نہ تھا بلکہ آپؐ کے ماننے والے ساتھی بھی کفار کے ہاتھوں سخت اذیتوں کا شکار تھے۔ آپؐ کے کسی جان نثار کو دہکتی ہوئی آگ پر لٹایا جاتا تو کسی کو تپتی ریت پر گھسیٹا جاتا۔ کسی کی ناک میں دھواں دیا جاتا تو کسی کو اس قدر مارا پیٹا جاتا کہ وہ لہولہان ہو کر بے ہوش ہو ہو جاتا۔ آپؐ کے کسی جاں نثار کو کھجور کی رسیوں میں جکڑ کر درے مارے جاتے تو کسی کے جسم کو آگ سے داغا جاتا۔ کئی ایک نے تو ظلم سہتے سہتے جان دے دی اور اپنے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کروالیا مگر مجال ہے جو ان کے ایمان میں ذرہ برابر بھی فرق آیا ہو"

"سچے مسلمان ایسے ہی بہادر ہوتے ہیں۔ وہ جان پر کھیل جاتے ہیں مگر اسلام پر آنچ ہرگز نہیں آنے دیتے" تابندہ نے کہا۔

"شاباش بیٹی، واقعی مسلمان کی شان یہی ہے" کرنل تیمور گہری سوچ میں ڈوبے کہانی سنا رہے تھے۔ بچوں کی آنکھوں سے بھی نیند کوسوں دور تھی اور وہ پوری دل چسپی اور توجہ سے کہانی سننے میں مگن تھے۔ "ہاں تو بچو! پیارے نبیؐ نے جب دیکھا کہ کافروں کے ہاتھوں مسلمانوں کا جینا دوبھر ہو رہا ہے تو آپؐ نے انہیں ہجرت کرنے کی اجازت دے دی" کرنل تیمور نے کہا۔

"دادا جانی ہجرت کسے کہتے ہیں؟" ذی شان نے سوال کیا۔

دادا بولے۔ "بچو! اپنے دین کے لیے خدا کی راہ میں وطن اور گھر بار چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جا بسنا ہجرت کہلاتا ہے۔ یوں اجازت پا کر کچھ مسلمان افریقہ کے ملک حبشہ

ہجرت کر گئے"۔

"ایک دفعہ حج کے دنوں میں مدینہ سے کچھ لوگ مکہ آئے۔ پیارے نبیؐ ان کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے آنحضورؐ کی پیاری پیاری باتیں سنیں تو وہ ایمان لے آئے۔ انہوں نے مدینہ پہنچ کر لوگوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ وہ نبیؐ جن کا صدیوں سے انتظار تھا' مکہ میں تشریف رکھتے ہیں۔ اس طرح گھر گھر پیارے نبیؐ اور آپؐ کی رسالت کا چرچا ہونے لگا۔ اگلے سال پھر بہت سے لوگ مکہ آئے اور اسلام کی برکتوں سے مالا مال ہوئے۔ مکہ کے کافروں نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے اور اب مدینہ کے بہت سے لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے تو انہوں نے اور بھی شدت سے مسلمانوں پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا۔ چناں چہ کافروں نے یہ پروگرام بنایا کہ ایک رات سب مل کر حضورؐ کو قتل کر دیں۔ قتل کی یہ تجویز اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل نے پیش کی تھی۔ ادھر کافر لوگ یہ شیطانی پروگرام بنا رہے تھے' ادھر اللہ نے آنحضورؐ کو کافروں کی اس سازش سے آگاہ کر دیا اور آپؐ کو مدینہ کی جانب ہجرت کرنے کا حکم بھی دیا۔ اس وقت حضورؐ کے قریبی ساتھیوں میں سے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ ہی مکہ میں موجود تھے' باقی تقریباً تمام مسلمان ہجرت کر کے جا چکے تھے۔

ایک رات جب پیارے نبیؐ گھر میں آرام فرما رہے تھے' پروگرام کے مطابق کافروں نے گھیرا ڈال دیا اور انتظار کرنے لگے کہ جونہی محمدؐ گہری نیند سو جائیں گے تو یک دم حملہ کر کے آپؐ کا کام تمام کر دیں گے۔ مگر جس کی حفاظت خود اللہ کرے اسے کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔ آدھی رات ہوئی تو آنحضورؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا دیا اور انہیں تاکید کی کہ میرے بعد لوگوں کی سب امانتیں واپس کر کے مدینہ چلے آنا۔ آپؐ گھر سے روانہ ہوئے اور قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے کافروں کے درمیان میں سے بحفاظت نکل آئے۔ خدا کی شان دیکھو کہ کافر ایسے غافل ہوئے کہ حضورؐ کو باہر نکلتے دیکھ ہی نہ سکے۔ آپؐ وہاں سے سیدھے اپنے جاں نثار ساتھی حضرت ابو بکرؓ کے گھر پہنچے۔ وہ پہلے ہی آپؐ کے منتظر تھے"۔

ننھی شیرازہ فوراً بولی "دادا ابو' حضرت ابو بکرؓ کو کیسے پتا تھا؟"

کرنل تیمور نے کہا ''بیٹا جی' پیارے نبیؐ نے ایک دن پہلے ان کو ہجرت کے پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کھانے پینے کا سامان' ستو اور پانی وغیرہ لیے آپؐ کے انتظار میں تھے۔ آنحضورؐ نے انہیں اپنے ساتھ لیا اور تین میل پیدل سفر کرنے کے بعد ثور نامی پہاڑ کی غار میں جا چھپے۔ ایک طرف شیطان اور کافروں نے آپؐ کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے پیارے نبیؐ کی حفاظت کا سامان کر رکھا تھا۔ اللہ کی حکمت کہ جونہی آپؐ اور آپؐ کے ساتھی حضرت ابو بکرؓ غار میں چھپے' اللہ کے حکم سے راتوں رات غار کے منہ پر مکڑی نے جالا بن دیا اور کبوتروں نے گھونسلا بنا لیا۔ صبح ہوئی تو کافر آنحضورؐ کی جگہ حضرت علیؓ کو سوتا پا کر تلملا اٹھے۔ ہر طرف آپؐ کی تلاش میں اپنے آدمی روانہ کر دیئے اور اعلان کروا دیا کہ جو بھی کوئی محمدؐ کو پکڑ لائے گا اسے بہت سا انعام دیا جائے گا۔ بہت کوشش کی یہاں تک کہ کافر حضورؐ کو تلاش کرتے کرتے غار ثور تک بھی پہنچ گئے مگر مکڑی کا جالا اور گھونسلے میں کبوتروں کے انڈے دیکھ کر انہیں ذرا بھی شک نہ گزرا کہ غار کے اندر بھی کوئی ہے۔ اس غار میں آپؐ نے تین دن قیام کیا۔ چوتھے روز حضرت ابو بکرؓ کا خادم چپکے سے دو اونٹنیاں لے آیا۔ چناں چہ آپؐ ان پر سوار ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں بریدہ اور سراقہ نامی افراد نے تعاقب کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ یہ مبارک سفر کئی دنوں تک جاری رہا۔ آخر کار نبوت کے تیرہویں سال 8 ربیع الاول پیر کے دن پیارے نبیؐ اپنے ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہمراہ مدینہ کی قریبی بستی قبا میں پہنچے۔ حضرت علیؓ بھی ہجرت کر کے یہیں آپؐ سے آملے۔ مدینہ کے لوگوں کو آپؐ کی تشریف آوری کی خبر ملی تو خوشی سے جھوم اٹھے۔ قبا کے مقام پر آپؐ نے مسجد کی بنیاد رکھی۔ جمعہ کے روز قبا سے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک جگہ آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جمعہ کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد آپؐ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔

چھوٹے بڑے سبھی آپؐ کے استقبال کے لیے گھروں

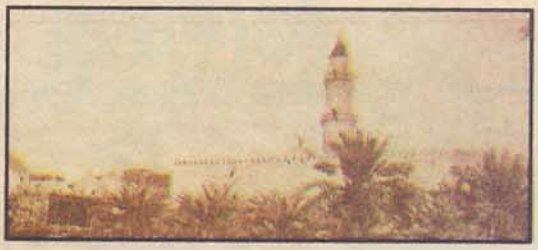

مسجد قبا (قدیم)

مسجد قبا (جدید تعمیر)

سے باہر نکل آئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں جھوم جھوم کر آپؐ کی تعریف میں شعر پڑھ رہی تھیں۔ سب مسلمان اللہ کا شکر بجا لاتے ہوئے پکار رہے تھے۔ ''اللہ کے رسولؐ آ گئے۔ اللہ کے نبیؐ تشریف لے آئے''۔

آنحضورؐ کے ساتھی جو ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تھے وہ بالکل بے سر و سامان تھے مگر مدینہ کے مسلمانوں نے ہر طرح سے ان کی امداد کی اور اپنا گھر بار مال و دولت سب کچھ پیارے نبیؐ کے قدموں میں نچھاور کر دیا۔

ہجرت کا یہ واقعہ در حقیقت کفر و شرک کی ہلاکت اور اسلام کی ترقی و منزلت کا ذریعہ ثابت ہوا۔ ہجرت کے اس عظیم واقعہ سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ مصیبتوں اور پریشانیوں سے انسان کو گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے اور دین اسلام کے لیے اگر گھر بار اور وطن سب کچھ چھوڑنا بھی پڑے تو کوئی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ یقیناً فتح حق اور سچ ہی کی ہوتی ہے''۔

سارے بچے کرنل تیمور کی باتوں میں محو تھے' رات کافی ہو چکی تھی مگر تھکاوٹ اور نیند کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ کرنل تیمور نے کہا ''ہاں تو میرے بچو' اسی ہجرت کے مبارک موقع کی مناسبت سے ہجری سال کا آغاز ہوا اور ہجری ایوارڈ بھی اسی کی یاد میں دیا جاتا ہے۔ اللہ کرے نیا ہجری سال مسلمان امت کے لیے اتحاد و یگانگت' خوش حالی اور آزادی و منزلت کا سنہری پیغام لائے''

سب نے یک زبان ہو کر کہا ''آمین''

سچی کہانی

ماں کی دعا

سید نظر زیدی

سمرقند اور بخارا اس علاقے کے دو بڑے شہر ہیں جسے ان دنوں ازبکستان کہا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں بخارا ایک بہت بڑی مسلم ریاست تھی۔ جو شہر اس ریاست کا دارالحکومت تھا اس کا نام بھی بخارا ہی تھا اور یہ اس زمانے میں علم و ادب کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہ علاقہ مسلمانوں نے امیر ولید اول اموی کے زمانے 709ء میں فتح کیا تھا اور اسے ایسی ترقی دی تھی کہ خوش حالی امن و امان اور علم کی ترقی میں یہ اپنی مثال آپ بن گیا تھا۔ اس کے باشندوں میں زیادہ تعداد ترکوں اور ایرانیوں کی تھی جو ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

اسی شہر بخارا میں ایک بہت بڑے عالم رہتے تھے جن کا نام ابوالحسن اسماعیل بن ابراہیم تھا۔ ان کا تعلق ایرانی نسل سے تھا۔ 13 شوال 194ھ کو ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ شکل صورت میں یہ بچہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھا۔ اس کی پیدائش پر پورے خاندان نے خوب خوشیاں منائیں۔ مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ مبارک سلامت کی دھومیں مچیں، لیکن قدرت کے کام نرالے ہیں۔ کچھ ہی دن بعد ایسا ہوا کہ یہ خوب صورت بچہ آنکھوں سے محروم ہو گیا۔

ہمارے موجودہ زمانے میں تو آنکھوں کی بیماریوں کا علاج بہت آسان ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ نئی آنکھیں لگا دی جاتی ہیں۔ نیک دل لوگ مرنے سے پہلے وصیت کر جاتے ہیں کہ موت کے بعد ہماری آنکھیں محفوظ کر لی جائیں اور کسی نابینا کے لگا دی جائیں۔ قابل ڈاکٹر ایسی آنکھیں ضرورت مندوں کے لگا دیتے ہیں اور وہ دیکھنے کے قابل بن جاتے ہیں، لیکن اس زمانے میں ایسی آسانیاں نہ تھیں۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج تو ہو جاتا تھا لیکن جس کی آنکھیں بے نور ہو جاتی تھیں وہ بے چارا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تاریکیوں میں ڈوب جاتا تھا۔

جس بچے کی یہ کہانی ہے اس کے ساتھ ایک اور بہت ہی رنج دینے والی بات یہ ہوئی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ چھوٹی عمر میں اس بچے کو تو ان دونوں محرومیوں کا اندازہ نہ ہو گا لیکن اس کی ماں پر تو گویا غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ غریب اپنے نابینا یتیم بچے کو دیکھتی تھی اور آنسو بہاتی تھی۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس زمانے کی مسلمان عورتیں اللہ کے احکام کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ انہیں اپنے بناؤ سنگار سے زیادہ نماز روزے کا خیال رہتا، یہاں تک کہ اپنے بچوں کو اس وقت تک دودھ نہ پلاتیں جب تک وضو کر کے پاک صاف نہ ہو جاتی تھیں۔ یہ خاتون بھی ایسی ہی تھیں۔ پانچوں وقتوں کی نماز ادا کرتیں اور پابندی سے اللہ کی کتاب قرآن مجید کی تلاوت کرتیں۔ اسے اپنے پیارے بیٹے کے نابینا ہو جانے کا رنج تو بہت تھا لیکن ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتی تھیں کہ کوئی کام اللہ کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا اور اگر انسان نے کوئی بڑا گناہ نہ کیا ہو تو ہر کام اس کے فائدے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس بات پر بھی اس کا پکا ایمان تھا کہ اگر عاجزی سے دعا مانگی جائے تو اللہ دعا قبول کرتا ہے اور بڑی سے بڑی مصیبت ٹل جاتی ہے۔ وہ ہر نماز کے بعد رو رو کر اپنے بیٹے کی بھلائی کے لیے دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں ٹھیک ہو جانے کی دعا تو وہ بہت مانگتی تھیں۔

زندگی اسی طرح گزر رہی تھی کہ ایک رات خواب میں اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت ہوئی۔ اللہ کے برگزیدہ رسول نے اس سے کہا کہ بی بی زیادہ پریشان نہ ہو۔ اللہ تیرے بیٹے کی آنکھیں ٹھیک کر دے گا۔ یہ خواب دیکھ کر وہ بیدار ہوئیں تو سچ مچ اس کے بیٹے کی آنکھیں ٹھیک ہو گئی تھیں۔ یہ دیکھ کر ماں کی

خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وضو کر کے شکرانے کی نفلیں پڑھیں۔ بیٹے کی آنکھیں چومیں اور اس کی بھلائی کی دعاؤں میں مصروف ہو گئیں۔

ایسے کام کو جو بغیر کسی ظاہری سبب کے ہو جائے معجزہ کہتے ہیں۔ نابینا لڑکے کی آنکھوں کا آپ سے آپ ٹھیک ہو جانا معجزہ ہی تھا۔ اللہ کے رسول نے خواب میں جو بشارت دی تھی، سچ ثابت ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس خوش نصیب لڑکے کو ایک اور برکت یہ ملی کہ اس کے دل میں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا اور حافظے کی قوت ایسی زبردست ہو گئی کہ جو بات ایک بار غور سے سنتا تھا پوری طرح یاد ہو جاتی تھی۔

جیسا کہ ہم نے بتایا ہے، اس زمانے میں بخارا علم و ادب کا بہت بڑا مرکز تھا۔ بڑے بڑے قابل اور عالم فاضل اس شہر میں رہتے تھے اور لوگوں کو فیض پہنچاتے تھے۔ اس خوش نصیب لڑکے نے اپنے شہر کے کئی عالموں سے علوم پڑھے اور ایسا لائق فائق بن گیا کہ اس کے ہم عمروں میں اس جیسا کوئی اور نہ تھا۔ اس کی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ ہے۔ ایک دن اس کے ایک استاد صاحب طالب علموں کو پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے ایک حدیث بیان کی تو یہ لڑکا ادب سے بولا۔ "جناب والا، اس حدیث شریف کے راویوں کی ترتیب اس طرح نہیں ہے جس طرح جناب نے بیان فرمائی ہے، بلکہ اس طرح ہے"۔

شاگرد کی یہ بات سن کر پہلے تو استاد صاحب بہت ناراض ہوئے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ کتاب اٹھالی جس میں یہ حدیث شریف درج تھی اور یہ دیکھ کر انہیں بہت حیرت ہوئی کہ راویوں کی ترتیب اسی طرح تھی جس طرح اس لڑکے نے بتائی تھی۔ اب انہوں نے خوش ہو کر اس کی کمر تھپکی اور اس کی بہت تعریف کی۔

اس لڑکے کی عمر 11 سال ہوئی تو وہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ حج کرنے کے لیے مکہ معظمہ گیا اور مزید علم حاصل کرنے کے لیے اپنی والدہ کی اجازت سے وہیں رہ گیا اور نہ صرف مکہ معظمہ بلکہ مدینہ منورہ، دمشق، کوفہ اور کئی اور شہروں میں جا کر نامی گرامی عالموں سے علم حاصل کیا۔ اس نے نو عمری ہی میں ایسا درجہ حاصل کر لیا کہ اس کا شمار بڑے عالموں میں ہونے لگا۔

یہ کہانی ہے دنیائے اسلام کے بہت بڑے عالم اور سب سے بڑے محدث حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی جن کی کتاب صحیح بخاری دنیا کے قریب قریب تمام دینی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے اور یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ قرآن مجید کے بعد دوسرا درجہ اسی کتاب کا ہے۔

جس وقت حضرت امام بخاری نے تعلیم مکمل کی رسول ﷺ کی حدیثیں جمع کرنے کا کام ہو رہا تھا اس سلسلے میں بعض لوگ ایسی بے پروائی کر رہے تھے کہ پوری تحقیق کے بغیر سنی سنائی باتوں کو حدیث مان لیتے تھے، بلکہ اس سے بھی آگے یہ کہ اسلام کے دشمنوں نے من گھڑت باتوں کو حدیث کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ حضرت امام صاحب نے اس خرابی کو پوری طرح سمجھا اور اپنے ذمے یہ کام لیا کہ ایک ایسی کتاب مرتب کریں گے جس

میں بالکل صحیح حدیثیں ہوں گی۔ یہ کام بہت مشکل تھا' لیکن آپ نے اللہ کا نام لے کر شروع کر دیا۔

علم حدیث میں یہ بات بہت ضروری ہے کہ حدیث بیان کرنے والوں کے بارے میں یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ جھوٹ بولنے والے نہ تھے اور نہ ان میں کوئی اور کمزوری تھی۔ نیز یہ بھی کہ یہ روایت انہوں نے کسی ایسے ہی نیک اور شریف آدمی سے سنی تھی۔ حدیث بیان کرنے والے کو راوی کہا جاتا ہے اور ان کے نام سلسلہ وار اس طرح لکھے جاتے ہیں کہ سلسلہ رسول ﷺ تک پہنچ جاتا ہے۔ یعنی فلاں نے فلاں صاحب سے سنا اور انہوں نے رسول ﷺ کو یہ بات فرماتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا۔ اگر اس طرح راویوں کا سلسلہ مکمل نہ ہو تو حدیث کو صحیح نہیں سمجھا جاتا۔

حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں صرف وہ حدیثیں لکھیں جن کے راویوں کا سلسلہ درست اور ان کے قابل اطمینان ہونے کا یقین ہو گیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ راویوں کے کردار کی طرف سے اطمینان کرنے کے لیے وہ اسی ہزار آدمیوں سے خود ملے اور اٹھارہ برس میں چھ لاکھ حدیثیں جمع کیں۔ پھر ان میں سے نو ہزار ایسی حدیثیں چھانٹیں جن کے درست ہونے میں معمولی سا شبہ بھی نہ تھا۔

یہ حدیثیں لکھنے کا کام انہوں نے پہلی بار حرم کعبہ میں بیٹھ کر کیا اور دوسری بار مسجد نبوی میں اس جگہ بیٹھ کر جو محراب اور منبر کے درمیان ہے اور جسے جنت کے باغوں کا ایک حصہ کہا جاتا ہے۔ یقیناً ان کی اس کوشش اور احتیاط کی برکت ہے کہ صحیح بخاری شریف کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس عظیم کتاب کے علاوہ امام صاحب نے پچیس کتابیں اور لکھیں اور ان میں پہلی کتاب اس وقت لکھی جب ان کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔

حضرت امام بخاری کا پورا نام ابو عبداللہ محمد بن ابوالحسن اسماعیل ہے۔ انہوں نے عمر کا زیادہ حصہ وطن سے باہر گزارا۔ بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونے لگے تو اپنے آبائی وطن بخارا آئے۔ یہاں لوگوں نے ان کا شاندار استقبال کیا' لیکن وہ خاص بخارا میں زیادہ دن نہ رہ سکے۔ امیر بخارا ان سے ناراض ہو گیا اور اس نے انہیں شہر چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ امیر کے ناراض ہونے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس نے خواہش ظاہر کی کہ امام صاحب اس کے محل آ کر اس کے بچوں کو پڑھایا کریں' لیکن امام صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا "میں عام مسلمانوں کے بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ انہیں محروم نہیں کر سکتا۔ آپ کے بچے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو میرے گھر آ جایا کریں"۔

اس بات پر امیر بگڑ گیا اور اس نے آپ کو شہر سے نکال دیا۔ بخارا چھوڑ کر امام صاحب خرتنگ نام کے ایک گاؤں چلے گئے جہاں ان کے کچھ عزیز رہتے تھے۔ یہ گاؤں ریاست کے دوسرے بڑے شہر سمرقند کے قریب تھا۔ سمرقند کے لوگوں کو امام صاحب کے خرتنگ آنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے سمرقند آنے کی دعوت دی۔ آپ نے یہ دعوت قبول بھی کر لی لیکن عین اس وقت جب آپ سفر کی تیاری کر رہے تھے' آپ پر بیماری کا حملہ ہوا اور 62 برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ تاریخ وفات یکم شوال (عید کے دن) 256ھ ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے حالات پڑھتے ہوئے جہاں ان کی شان اور بڑائی ظاہر ہوتی ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہ ساری کامیابیاں اور شان و شوکت ان کی ماں کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ اگر وہ رو رو کر ان کے لیے دعائیں نہ مانگتیں اور اللہ ان کی دعائیں قبول کر کے ان کی آنکھیں اچھی نہ کر دیتا تو وہ ایک نابینا آدمی کی طرح زندگی گزارتے۔ آنکھوں کے بغیر اتنے بڑے محدث بن جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یقیناً یہ مرتبہ انہیں ان کی مہربان ماں کی وجہ سے ملا اور ایک انہی کا کیا ذکر دنیا میں جن لوگوں نے بھی کوئی بڑا مقام حاصل کیا۔ اپنی ماؤں کی محبت' توجہ اور محنت سے حاصل کیا۔ یہ ماں ہی ہوتی ہے جو بچے کو پال پوس کر بڑا کرتی ہے۔ خود طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کر بچوں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اطمینان سے علم حاصل کریں اور اپنی ہمت کے مطابق کامیابیاں حاصل کر کے عزت سے زندگی گزاریں۔ پس یہ ضروری ہے کہ بچے اس بات کو اچھی طرح سمجھیں اور اپنی اپنی امی جان کی سچے دل سے عزت کریں۔ ان کی خدمت کر کے ان کی دعائیں لیں۔ جو بچہ بھی ایسا کرے گا ان شاء اللہ بڑا آدمی بنے گا!

پانی

اجمل وجیہہ

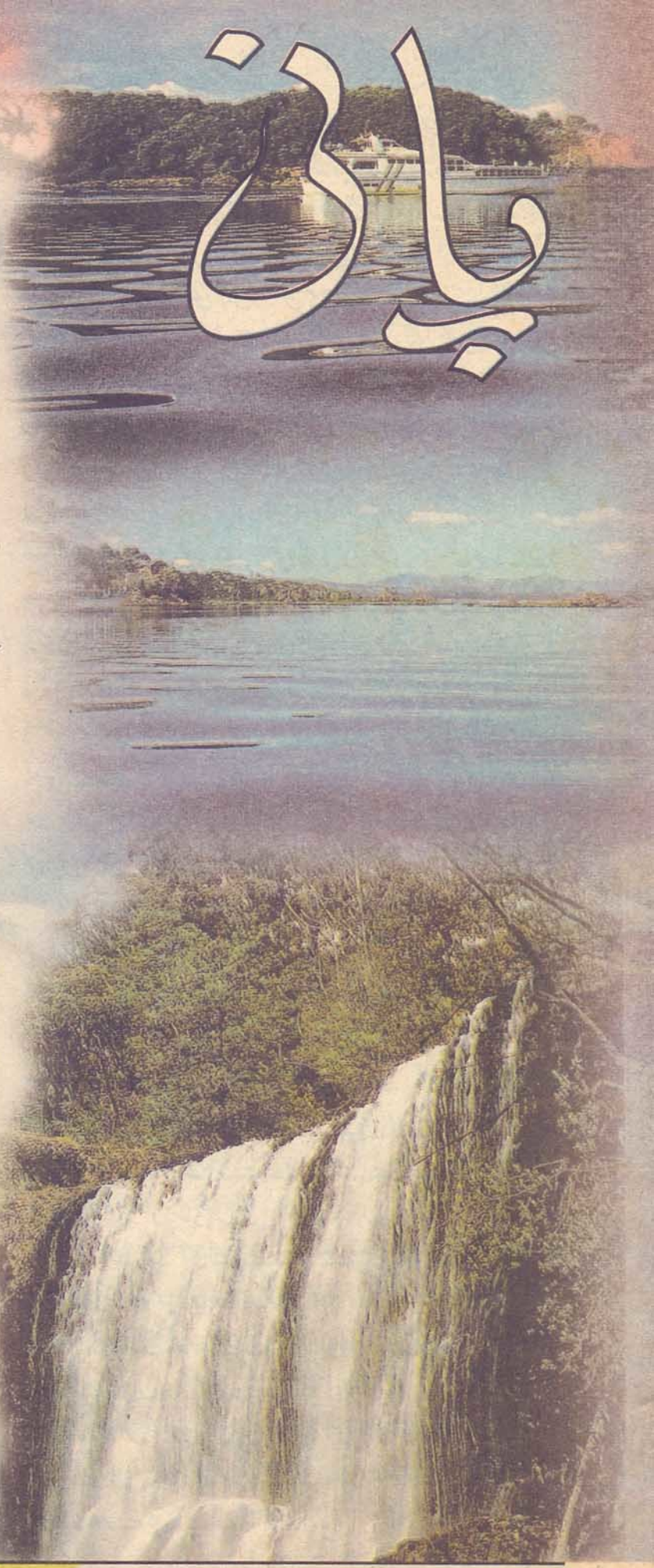

پانی ہوں میں پانی ہوں
پانی ہوں میں پانی ہوں
رہتا ہوں میں جھیلوں میں
بہتا ہوں میں چشموں میں
میرا روپ ہے ندیا بھی
میرا نام ہے دریا بھی
سات سمندر میرا گھر
کرتا ہوں دن رات سفر
دھوپ لگے اڑ جاتا ہوں
بادل میں مسکاتا ہوں
سردی میں گھبراتا ہوں
بارش بن کر آتا ہوں
بستی بستی پھرتا ہوں
دریا میں جا گرتا ہوں
پھول کھلا دیتا ہوں میں
رنگ جما دیتا ہوں میں
سب کی پیاس بجھاتا ہوں
ہر اک کے کام آتا ہوں
مجھ کو سارے پیتے ہیں
مجھ کو پی کر جیتے ہیں

بخدمت جناب ایڈیٹر

آپ کا خط ملا

سرورق زبردست تھا۔ کہانیوں میں قسمت کا دھنی' چاچو چاند بنے بھوت' تلاش گم شدہ اور زرد رو خان بہت پسند آئیں۔ مضمون میرا تھان ریس بھی اچھا لگا (سید عثمان سعید سرائے عالم گیر)

گو کہ میں بچی نہیں ہوں مگر اتنا سادہ اور معصوم بچوں کا رسالہ دیکھا تو بہت پسند آیا۔ یہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بڑا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ خدا اس کو مزید ترقی دے (عمارہ مشتاق راول پنڈی)

تمام کہانیاں اچھی تھیں لیکن ایک قیدی کی آپ بیتی' تلاش گم شدہ اور زرد رو خان بہت اچھی لگیں۔ لطیفوں کی بات ہی کچھ اور تھی (عبدالسمیع اسلام آباد)

سرورق اچھا تھا۔ کہانیوں میں پر اسرار ڈاکٹر' زرد رو خان اور تلاش گم شدہ بہت اچھی تھیں۔ مجرم کون؟ ذرا مشکل دیا کریں (وجاہت مرزا راول پنڈی)

کہانیاں سب ہی بہت اچھی تھیں۔ قسمت کا دھنی' تلاش گم شدہ' پراسرار ڈاکٹر اور زرد رو خاں بہت پسند آئیں۔ نظم کیڈٹ بھی پسند آئی۔ سلسلہ وار ناول "گڑھے میں لاش" شروع کرنے کا بے حد شکریہ (روبینہ لاہور)

قسمت کا دھنی اور تلاش گم شدہ کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ معیار کو برقرار رکھنا تعلیم و تربیت کا ہی کام ہے (آصف الرحمان چنیوٹ)

کہانیوں میں تلاش گم شدہ' زرد رو خاں اور چاچو چاند بنے بھوت سب سے زیادہ پسند آئیں۔ باقی تمام کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ نظمیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ لطائف بہترین تھے (مدیحہ ملک لاہور)

میں ہر مہینے تعلیم و تربیت کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتا ہوں۔ اپریل کے رسالے کا سرورق بہت اچھا تھا۔ کہانی آخری تدبیر بہت اچھی لگی (سعد رئیس احمد لاہور)

یہ واحد شمارہ ہے جس میں سب کے لیے سب کچھ ہے۔ اس میں تعلیم بھی ہے اور تربیت بھی۔ اس شمارے میں جو کہانیاں سب سے زیادہ پسند آئیں وہ قسمت کا دھنی اور تلاش گم شدہ ہیں (ثانیہ فردوس لاہور)

تعلیم و تربیت کو 59 سال مکمل ہونے کی مبارک باد۔ نئے ناول کے آغاز کا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ سرورق اچھا تھا۔ کہانیوں میں تلاش گم شدہ اور زرد رو خان اچھی لگیں (محسن جمشید راؤ لاہور)

ٹائٹل بہت دل کش تھا۔ تمام نظمیں بہت اچھی تھیں۔ سنی سنائی ایک دل چسپ سلسلہ ہے۔ زرد رو خان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ سائنس فکشن کی کہانی "پراسرار ڈاکٹر" نے آخری جملے تک سسپنس قائم رکھا۔ میں تقریباً 10 سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں اور ہمیشہ اسے معیاری اور بہترین پاتی ہوں (عائشہ بانو اسلام آباد)

میں نے آپ کی ایک غلطی پکڑی ہے۔ وہ یہ کہ "چاچو چاند بنے بھوت" میں چاچو کا حلیہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ان کے ایک پیر کا جوتا غائب ہے کیوں کہ وہ کیاری ہی میں رہ گیا تھا مگر تصویر میں ان کے دونوں پیروں میں جوتا موجود ہے (سدرہ جمال فیصل آباد)

ناول شروع ہونے کی خوش خبری پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مارچ کے مہینے کی سب سے زیادہ اچھی کہانی قسمت کا دھنی لگی۔ اس کے بعد تلاش گم شدہ' وطن کی محافظ اور چاچو چاند بنے بھوت زبردست کہانیاں تھیں (عائشہ لئیق احمد لاہور)

21 ویں صدی کا چوتھا شمارہ بہت شان دار تھا۔ ہمیشہ کی طرح پورا رسالہ اپنی مثال آپ تھا۔ شرارتی لکیریں اور کارٹون کہانی بے حد پسند آئیں۔ سنی سنائی کہانیوں کا سلسلہ بہت اچھا ہے (نازیہ لاہور)

کہانیاں پراسرار ڈاکٹر' قسمت کا دھنی' چاچو چاند بنے بھوت اور تلاش گم شدہ بہت اچھی تھیں۔ نظم کیڈٹ بہت اچھی لگی۔ تمام سلسلے بہت اچھے جا رہے ہیں (محمد اورنگ زیب کھڈیاں)

مجھے جو سلسلہ سب سے زیادہ پسند ہے وہ ہے سائنس فکشن۔ کیوں کہ میں بھی سائنس کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ سب سے زیادہ قابل تعریف سلسلہ آپ بھی لکھتے ہے۔ اس سلسلے میں نئے لکھاڑیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے (ثمینہ لیاقت تھہ وڈانہ)

سرورق کچھ خاص نہ تھا۔ اداریہ پڑھ کر دل کو کچھ سکون حاصل ہوا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں بحیثیت مجموعی اچھی تھیں۔ اگلے ماہ سے ناول کے آغاز کا سن کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سچی کہانی' سائنس فکشن اور سنی سنائی نے دل موہ لیا۔ کرکٹ کے بارے میں معلومات سے ساتھی بہت مستفید ہو رہے ہیں (زینب مصطفیٰ لاہور)

سرورق انتہائی خوب صورت تھا۔ کہانیاں سب ہی اچھی تھیں۔ لطائف نہایت ہی عمدہ تھے۔ دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے ختم کر کے کوئی اور اچھا سا سلسلہ شروع کریں (شکیل دلاور واہ چھاؤنی)

جگ مگاتا تعلیم و تربیت جلد ہی مل گیا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں پسند آئیں۔ کہانی تلاش گم شدہ میں ریزرویشن کی جگہ آبزرویشن لکھا جانا چاہیے تھا (روحی زہرا ملتان)

* نشان دہی کا شکریہ 'اڈیٹر

اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں دل چسپ تھیں لیکن وطن کی محافظ' چاچو چاند بنے بھوت' تلاش گم شدہ اور زرد رو خان بہت پسند آئیں (ارسلان جاوید چک خاصہ جہلم)

تمام کہانیاں پسند آئیں۔ خاص طور پر وطن کی محافظ' آخری تدبیر' تلاش گم شدہ' ایک قیدی کی آپ بیتی اور زرد رو خان لاجواب تھیں۔ چاچو چاند بنے بھوت پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ ملاجی بھی بہت مزے دار تھے۔ آپ چٹ پٹے مسالے دار دوبارہ شروع کریں اور مجرم کون؟ ذرا مشکل دیا کریں (انعم انجم لاہور)

انکل! میں آپ سے ناراض ہو گئی ہوں۔ مجھے یاد تو نہیں کہ میں نے اب تک کتنے خط لکھے ہیں لیکن گزشتہ شمارے میں آپ نے میرا صرف ایک لائن کا خط شائع نہیں کیا جب کہ دوسروں کے 16'16 لائنوں کے خط شائع ہوئے۔ پچھلا رسالہ ہر لحاظ سے اچھا تھا مگر میں اداس تھی (سدرہ منور لاہور)

کہانیوں میں آخری تدبیر' تلاش گم شدہ اور زرد رو خان پسند آئیں۔ اپنا خط شائع ہوا دیکھ کر دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر آپ کو مکھن لگاتے رہیں تو آپ خوش رہتے ہیں (حرا ماہین ملک راول پنڈی)

کہانیوں میں وطن کی محافظ' چاچو چاند بنے بھوت اور آخری تدبیر بہت پسند آئیں۔ حسن ذکی کاظمی کی کہانی پراسرار ڈاکٹر ایک دل چسپ کہانی ہے۔ ملا نصر الدین کو پڑھ کر ہنسی قابو میں نہ رہی۔ نظموں میں بچہ اخبار اور کیڈٹ بہت پسند آئیں (فاطمۃ الزہرا راول پنڈی)

سرورق کچھ خاص نہ تھا۔ کہانیوں میں قسمت کا دھنی' چاچو چاند بنے بھوت' تلاش گم شدہ نیز زرد رو خان اور سرخ گلاب بہت شان دار تھیں (عدنان علی فیصل آباد)

اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ خصوصاً درس قرآن' قسمت کا دھنی اور آخری تدبیر بہت ہی شان دار لگیں۔ دیگر کہانیاں بھی اچھی تھیں (سمیرا یاسمین فتح پور)

ٹائٹل بہت دل چسپ تھا۔ "گڑھے میں لاش" کا پڑھ کر دل خود بخود خوشی سے اچھلنے لگا۔ کرکٹ کیا اور کیسے؟ کا سلسلہ بہت اچھا ہے براہ مہربانی معین خان کا انٹرویو شائع کریں۔ روشن مینار کا سلسلہ بہت خوب ہے۔ اس سے ہمیں اہم شخصیتوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں (محمد احمد شرق پور)

کہانیاں سب اچھی تھیں لیکن قسمت کا دھنی' آخری تدبیر' تلاش گم شدہ اور زرد رو خان اپنی مثال آپ تھیں۔ سائنس فکشن کی کہانی پراسرار ڈاکٹر بھی اچھی تھی۔ کارٹون کہانی اور آیئے مسکرائیں بھی اچھے تھے۔ اشتیاق احمد صاحب کے ناول گڑھے میں لاش کا شدت سے انتظار ہے (ثاقب محمود مرید کے)

مجھے کہانیوں میں سچی کہانی' وطن کی محافظ' چاچو چاند بنے بھوت اور سنی سنائی بہت اچھی لگیں (شبیر احمد منڈی فیض آباد)

سرورق بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں سچی کہانی' وطن کی محافظ' زرد رو خان اور تلاش گم شدہ اچھی لگیں (عفراء نعیم مرید کے)

سائنس فکشن بہت ہی دل چسپ تھی۔ دوسری تحریروں میں آخری تدبیر' تلاش گم شدہ' زرد رو خان اور سچی کہانی بہت پسند آئیں۔ کرکٹ کیا اور کیسے؟ دل چسپ اور نیز ناقابل یقین بھی دل چسپ سلسلے ہیں۔ ٹائٹل پر اگر جانوروں کی تصویروں کے بجائے خوب صورت مناظر وغیرہ دیں تو بہت اچھا ہو (شفیق الرحمان لاہور)

سرورق بہت اچھا لگا۔ ہمیشہ کی طرح پورا رسالہ اپنی مثال آپ تھا۔ سنی سنائی کا سلسلہ بے حد دل چسپ ہے۔ کہانیوں میں چاچو چاند بنے بھوت' تلاش گم شدہ اور زرد رو خان بہت اچھی تھیں (صوبیہ عمر لاہور)

اس دفعہ کہانیاں سب اچھی تھیں مگر وطن کی محافظ' چاچو چاند بنے بھوت' تلاش گم شدہ اور ایک قیدی کی آپ بیتی زیادہ مزے دار تھیں۔ لطائف بھی مزے کے تھے (محمد قاسم عزیر لاہور)

سرورق خوب صورت تھا۔ کہانیوں میں وطن کی محافظ' تلاش گم شدہ اور زرد رو خان اور سرخ گلاب بہترین تھیں۔ سائنس فکشن زبردست تھی (رافعہ امتیاز' راکعہ امتیاز' اریبہ امتیاز' فیصل آباد)

اس ماہ کا ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ لطائف بہت اچھے تھے اور کہانیوں میں وطن کی محافظ' چاچو چاند بنے بھوت اور کارٹون کہانی بہت پسند آئیں (انیلہ محفوظ کیانی راول پنڈی)

تمام کہانیاں اچھی تھیں لیکن مجھے چاچو چاند بنے بھوت' ایک قیدی کی آپ بیتی اور زرد رو خان بہت اچھی لگیں۔ سنی سنائی کہانی کا سلسلہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس ماہ آخری تدبیر کہانی بہت اچھی لگی۔ باقی تمام

سلسلے بھی کافی اچھے جارہے ہیں (عائشہ افتخار لاہور)

ہمیشہ کی طرح تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خصوصاً زردروخان' تلاش گم شدہ اور چاچو چاند بنے بھوت زیادہ پسند آئیں (نمرہ چودھری فیصل آباد)

کہانیوں میں قسمت کا دھنی اور آخری تدبیر بہت اچھی لگیں۔ سنی سنائی اور سچی کہانی مجھے اس قدر پسند ہیں کہ میں سب سے پہلے انہیں پڑھتی ہوں۔ دوسری کہانیوں میں زردروخان اور سرخ گلاب اور تلاش گم شدہ اچھی لگیں۔ بچہ اخبار نظم بہت اچھی لگی۔ بچوں کے بہت سے رسالے میری نظر سے گزرے ہیں لیکن تعلیم وتربیت کے معیار جیسا کوئی نہ ملا (اسما سہیل مدنی لاہور چھاؤنی)

ٹائٹل بہت ہی منفرد اور خوب صورت تھا۔ ہم تو ٹائٹل دیکھ کر ہی جھوم اٹھے۔ اسی طرح جھومتے ہوئے زردروخان کی طرف بڑھے۔ اف خدایا اتنی خوب صورت کہانی۔ اس کی تعریف الفاظ میں ممکن نہیں۔ جناب حامد مشہود کو اتنی خوب صورت اور بہترین کہانی لکھنے پر مبارک باد (صدف حنیف جڑانوالہ)

ہزار بار خط لکھا' اللہ کے بندو کوئی ایک ہی چھاپ دو۔ آخر ہمارا بھی دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ خیر جو بھی ہے شمارا بہترین تھا۔ قسمت کا دھنی' کیڈٹ' چاچو چاند بنے بھوت' زردروخان اور کرکٹ کیا اور کیسے؟ بہترین تحاریر ہیں (محمد نصیر علی شاہدرہ)

ہمیشہ کی طرح پورا رسالہ اپنی مثال آپ تھا۔ کہانیوں میں زردرو خان زبردست رہی۔ اس دفعہ نظمیں بھی بہترین تھیں۔ ہمیں سال نامے کا شدید انتظار ہے (اشفاق احمد حسن لاہور چھاؤنی)

کہانیوں میں قسمت کا دھنی' آخری تدبیر' پراسرار ڈاکٹر اور زرد روخان بہت پسند آئیں۔ ملا نصرالدین کی کہانی پڑھ کر بہت مزا آیا۔ درس قرآن نے دل و دماغ روشن کر دیئے۔ انکل! آپ دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے ختم کر کے چٹ پٹے مسالے دار کا سلسلہ شروع کر دیں (سدرہ سلیم' عمارہ سلیم' محمد اویس لاہور)

یوں تو تعلیم وتربیت ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے لیکن اس کے چند پہلو قابل تنقید بھی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ مجھے ایک ہی انعامی کتاب دوبار بھیج چکے ہیں۔ تازہ شمارہ ہمیشہ بازار میں 5 یا 6 تاریخ کو آتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ "آپ کا خط ملا" میں جواب طلب خطوط کا جواب بھی نہیں دیتے (ساجد علی تبسم بہاول پور)

اپریل کا شمارہ نہایت دل چسپ اور اپنی مثال آپ تھا۔ کہانیوں میں قسمت کا دھنی اور آخری تدبیر بہترین تھیں۔ زردروخان اور نظم بچہ اخبار بھی بہت پسند آئیں (شجاع' فائزہ طاہر' سائرہ لاہور)

سرورق بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ شرارتی لکیروں اور لطیفوں کا تو مزہ ہی کچھ اور تھا۔ چٹ پٹے مسالے دار کا سلسلہ بھی شروع کریں (منیبہ سلمان لاہور)

وطن کی محافظ نجمہ معراج' درس قرآن ڈاکٹر عبدالرؤف' پراسرار ڈاکٹر حسن ذکی کاظمی' ایک قیدی کی آپ بیتی معراج محمد جبریل اور آپ بھی لکھئے میں تمام کہانیاں اچھی ہیں (عامر بشیر اوکاڑہ)

ٹائٹل بہت دل چسپ تھا۔ یوں تو تمام کہانیاں اچھی اور نئی تھیں مگر قسمت کا دھنی' وطن کی محافظ' چاچو چاند بنے بھوت اور تلاش گم شدہ بہت اچھی تھیں (حبیبہ نقی راول پنڈی)

ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ باقی تمام کہانیاں اور کرکٹ کیا اور کیسے؟ بہت اچھی تحریر تھی (حافظ مبشر اقبال نیو ملتان)

سرورق نہایت دل چسپ تھا۔ کہانی چاچو چاند بنے بھوت زیادہ پسند آئی۔ آپ بھی لکھئے میں کہانی سہارا بہت اچھی لگی۔ روشن مینار کا سلسلہ بھی اچھا جارہا ہے (ماریہ چودھری فیصل آباد)

اپریل کا شمارہ مجموعی طور پر اچھا لگا۔ ہمیں تو امید تھی کہ آپ اعلان کریں گے کہ مئی میں سال نامہ آئے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ کوپن کاٹتے ہوئے رسالہ خراب ہو جاتا ہے براہ کرم تمام سلسلوں کے کوپن ایک ہی صفحے پر دیا کریں (جویریہ نصیر' حفصہ نصیر احمد کراچی)

ٹائٹل کچھ خاص نہ تھا۔ کہانیوں میں آخری تدبیر بہت زبردست تھی۔ اس کے علاوہ پراسرار ڈاکٹر بھی بہت اچھی تھی۔ سلیم خان گمی کی کہانی تلاش گم شدہ ہمیں بالکل پسند نہیں آئی۔ انہیں چاہیے کہ وہ اپنی پہلے والی کہانیاں یعنی شکاریوں والی کہانیاں ہی لکھا کریں (ندا اشفاق لاہور)

ہم تعلیم وتربیت کے 1994ء سے باقاعدہ قاری ہیں۔ بلکہ فین ہیں۔ اس ماہ تمام کہانیاں خوب تھیں۔ یہ آپ نے مجاہدین آزادی کا سلسلہ کیوں بند کر دیا ہے؟ نیز یہ کہ "نشان حیدر پانے والے" کے عنوان سے صرف دو نشان حیدر کا فیچر کیوں چھاپا؟ اب باری باری تفصیل سے بقیہ نشان حیدر پانے والوں کے بارے میں بھی لکھیں۔ آپ نے کرکٹ سکھانے کا اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ پہلے دیکھنے کا شوق تھا اب سمجھ کر دیکھنا اور اچھا لگتا ہے۔ ہمارے بڑے بھائی تو رسالہ پڑھتے ہی صرف اس کے لیے ہیں۔ چھوٹے بھائی کو ملا نصرالدین کی کہانی بہت پسند ہے۔ اسے اعتراض ہے کہ ہر بار ملا ہی کی شامت کیوں آتی ہے (افق قریشی' مزمل قریشی' مدثر قریشی' منیر قریشی لاہور)

* * *

بچوں کے لیے

درس قرآن

نماز کی اہمیت

ڈاکٹر عبدالرؤف

بچوں کے لیے درس قرآن میں اس دفعہ ہمارا موضوع ہے: "نماز کی اہمیت" باقاعدگی سے نماز پڑھنے کے بارے میں قرآن حکیم میں بے شمار احکام کا ذکر ہے۔ مثلاً سورہ البقر کی آیت نمبر 43 شروع ہی ان مبارک الفاظ سے ہوتی ہے:

اَقیموا الصلوٰۃ

ترجمہ: نماز قائم کرو!

ہر مسلمان کے لیے پانچ نمازیں فرض ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں: (1) نماز فجر یعنی صبح کی نماز (2) نماز ظہر یعنی دوپہر کی نماز (3) نماز عصر یعنی سہ پہر کی نماز (4) نماز مغرب یعنی شام کی نماز (5) نماز عشاء یعنی رات کی نماز۔ جمعہ کے روز نماز ظہر کے بجائے نماز جمعہ پڑھی جاتی ہے جسے بے حد اہمیت حاصل ہے۔

ہر نماز کے لیے مسجد میں باقاعدہ اذان دی جاتی ہے جسے ہر خاص و عام کے لیے نماز میں شمولیت کا کھلا دعوت نامہ سمجھا جاتا ہے۔ نماز سے پہلے وضو ضروری ہے۔ جس کا مقصد جسم کے اہم حصوں کو صاف پانی سے دھو کر صاف ستھرا کرنا ہے۔ نماز پڑھانے والے شخص کو امام یعنی لیڈر کہتے ہیں۔ اس کے لیے نیک اور سمجھ دار ہونا لازمی ہے۔ امام نمازیوں کی قطاروں سے آگے کھڑا ہو کر اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔

نماز انسان میں صحت و سلیقہ اور ضبط و نظم کی خوبیاں بڑھانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ صفیں سیدھی کر کے باجماعت نماز کے لیے مسلمان جب کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں تو نیکو کاروں کا ایک بے حد خوب صورت اور منظم دستہ سا دکھائی دیتے ہیں۔ نماز ہر بدی سے بچاؤ کی تربیت دیتی ہے اور ہر نیک اور بھلے خیال اور کام کے لیے بڑے عمدہ طریقے سے آمادہ کرتی ہے۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کے پروگرام میں نماز والدین اور اساتذہ کے بہت آڑے آتی ہے۔ جن خوش نصیب بچوں کو ابتدائی عمر ہی سے نماز کی پابندی کی تربیت دے دی جائے وہ زندگی کے ہر موڑ پر طرح طرح کی برائیوں اور بدیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ برے خیالوں اور بری حرکتوں کی پھسلنیں انہیں گم راہ کرنے میں ناکام رہتی ہیں اور یوں ان کے سامنے تعمیر و ترقی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

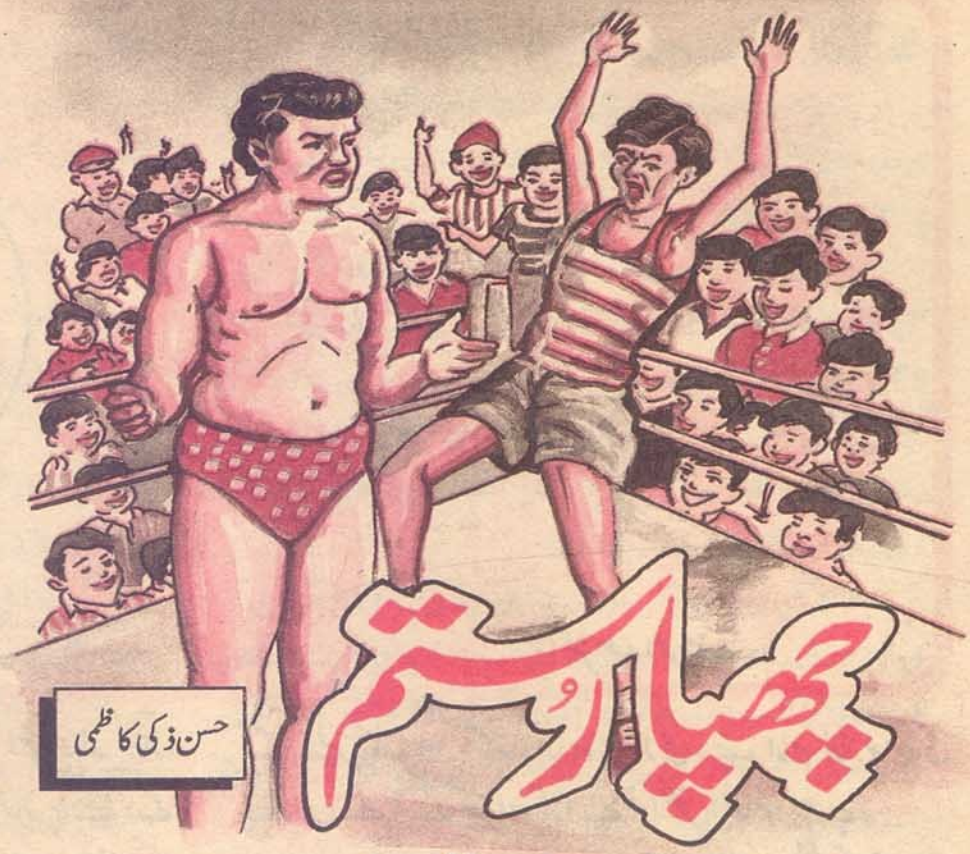

چھپا رستم

حسن ذکی کاظمی

آج پھر سر سید ہال اور جناح ہال کا کشتی کا میچ تھا۔ دونوں طرف بے انتہا جوش و خروش نظر آرہا تھا کیوں کہ اس میچ میں یہ فیصلہ ہونا تھا کہ اس سال کالج میں کشتی کا چمپئن کون ہوگا۔ اقبال ہال اس سال تیسری پوزیشن پر تھا۔ رہا کالج کا چوتھا ہال یعنی لیاقت ہال تو اس کا کشتی کے میدان میں دور دور پتا نہ تھا۔ اس ہال میں ابھی تک کوئی ایسا طالب علم ہی نہیں آیا تھا جو اکھاڑے میں اترتا۔ بس سر سید ہال، جناح ہال اور اقبال ہال کے درمیان مقابلہ ہوتا اور ان میں سے کبھی کسی ہال کا طالب علم چمپئن قرار پاتا اور کبھی کسی کا۔

سہ پہر کو اکھاڑے کے ارد گرد بہت سے لڑکے جمع تھے۔ پرنسپل صاحب کے علاوہ بہت سے استاد بھی موجود تھے۔ سر سید ہال سے شعیب اور جناح ہال سے معین اکھاڑے میں اترے۔ تالیوں کی گونج میں انہوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ سیٹی بجتے ہی دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ دونوں کے حمایتی ایک زور دار نعرہ لگا کر اپنے اپنے پہلوان کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ شعیب اور معین کو اکھاڑے میں اترے خاصی دیر ہو گئی تھی لیکن مقابلہ برابر تھا۔ نہ شعیب ہمت ہارتا تھا اور نہ معین دل چھوڑتا تھا۔ مقابلے کا وقت ختم ہونے والا تھا کہ اچانک معین نے ایک ایسا داؤ مارا کہ شعیب سنبھل نہ سکا اور پلک جھپکتے میں زمین پر چت گرا۔ پھر جو شور ہوا تو معلوم ہوتا تھا کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ تالیاں، سیٹیاں، بگل، نعرے، آتش بازی غرض کہ کوئی چیز باقی نہ رہی۔ معین پھولوں کے موٹے موٹے ہار پہنے اپنے ایک ساتھی کے کندھے پر تھا اور فضا جناح ہال زندہ باد اور معین احمد زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ کچھ من چلوں نے اپنے نعروں میں معین کو رستم جناح ہال کے خطاب سے بھی نواز دیا۔

معین کے حمایتیوں کا جوش ذرا ٹھنڈا ہوا تو پرنسپل صاحب اسٹیج پر آئے۔ انہوں نے شیلڈ اور پہلا انعام جناح ہال کو، دوسرا انعام سر سید ہال کو اور تیسرا اقبال ہال کو دینے کے بعد اپنی تقریر میں جناح ہال اور معین احمد کو بہت بہت مبارک باد دی نیز سر سید ہال اور اقبال ہال کی کوششوں کی بھی تعریف کی۔ لیکن اس بات پر بہت افسوس ظاہر کیا کہ لیاقت ہال کو کشتی سے بالکل دل چسپی نہیں اور اس ہال نے آج تک کشتی کے مقابلوں میں کوئی انعام حاصل نہیں کیا۔

یہ تقریب ختم ہوئی تو سارے طالب علم شور مچاتے، نعرے لگاتے میدان میں سے جانے لگے۔ سر سید ہال اور اقبال ہال والوں کو ہارنے کا غم نہیں تھا کیوں کہ وہ کسی طرح کم نہ تھے اور کئی بار یہ مقابلہ جیت چکے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ مقابلہ سخت ہونا چاہیے۔ ہار جیت تو کھیل میں ہوتی ہی رہتی ہے۔ البتہ لیاقت ہال والوں کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ وہ پہلے ہی شرمندہ تھے۔ پرنسپل صاحب کی باتوں نے انہیں اور بھی شرمندہ کر دیا۔

دوسرے دن سے لیاقت ہال میں یہ موضوع سب سے اہم تھا کہ آئندہ سال کسی طرح کشتی کے مقابلے میں نہ صرف شرکت کی جائے بلکہ انعام بھی حاصل کیا جائے۔ بڑے جوشیلے انداز میں گفت گو ہوتی۔ منیر اس گفت گو میں سب سے آگے ہوتا۔ ایک دن لیاقت ہال کے بہت سے لڑکے کامن روم میں جمع تھے۔ موضوع

کشتی کا مقابلہ تھا اور منیر میاں بڑے زوروں میں تقریر کر رہے تھے۔

"دوستو! اگر یہی حال رہا تو ہم کالج میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے"۔

"بھلا ایسا بھی کیا ڈر؟ ہمیں ہمت اور حوصلہ سے کام لے کر...." اکرام نے منیر کی بات کاٹی۔

"یار! بڑی اچھی بات ہے۔ میں کہتا ہوں پھر تم ہی کر لو نہ ہمت اور حوصلہ"۔ شہزاد نے فقرہ کسا۔

"ہاں بھائی! تم ہی ہماری عزت رکھ لو تاکہ ہم لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل ہو جائیں"۔

اس پر ایک زوردار قہقہہ لگا۔ قہقہے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ منیر کافی دبلا پتلا سا لڑکا تھا جسے دیکھ کر کبھی کشتی کا خیال ہی نہیں آسکتا تھا۔ منیر دوستوں کے طنزیہ قہقہے کا وار سہ گیا اور سنبھلتے ہوئے بولا۔

"میں ضرور مقابلہ کرتا۔ لیاقت ہال کی عزت کے لیے اپنی جان لڑا دیتا لیکن تم لوگ جانتے ہو کہ اس میدان میں میرا کوئی تجربہ نہیں"۔

لڑکے پھر زور سے ہنسے اور ان میں سے کسی نے فقرا چست کیا۔

"خیر تجربہ تو تمہارا کسی بھی میدان میں نہیں، چلو اسی میدان میں کچھ نام پیدا کر لو۔ ابھی تو سال پڑا ہے"۔

منیر نے احتجاج کیا "یار! اتنا اہم معاملہ ہے اور تم لوگوں کو مذاق سوجھا ہے۔ اس معاملہ پر ذرا سنجیدگی سے سوچو"۔

شہزاد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بھائی، سوچنا کیا ہے۔ اکھاڑے میں آج سے تم ہماری نمائندگی کرو گے"۔

منیر نہیں نہیں کرتا رہا لیکن ایک لڑکے نے اسے کندھے پر اٹھا لیا اور نعرے لگنا شروع ہو گئے۔ "ہمارا ہیرو، منیر خان، ہمارا چمپئن منیر خان، سب سے آگے منیر خان، کبھی نہ بھاگے منیر خان"

اس دن سے منیر خان واقعی لیاقت ہال کے ہیرو بن گئے۔

منیر کی حالت یہ تھی کہ اکھاڑے کو دور سے دیکھ کر اس کی جان نکلتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھی اسے زبردستی اکھاڑے میں دھکیل دیتے تھے۔ پریکٹس کے دوران میں منیر کی خاصی گت بنتی۔ کئی بار اس کے چوٹ بھی آگئی لیکن اس کے ساتھی کسی صورت اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ اسی طرح دو ڈھائی مہینے گزر گئے۔ منیر کے دوستوں اور ساتھیوں نے لیاقت ہال کے وارڈن سے اصرار شروع کیا کہ وہ کشتی کے آئندہ مقابلے کے لیے اپنے ہال کی طرف سے منیر خان کا نام ضرور بھیجیں۔ وارڈن کو اندازہ تھا کہ یہ سب مذاق ہے لہٰذا انہوں نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

"اچھا جب وقت آئے گا تو دیکھیں گے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے"۔

کچھ دن کے بعد وارڈن کو محسوس ہوا کہ لڑکے مذاق نہیں کر رہے بلکہ خاصے سنجیدہ ہیں۔ اب تو انہیں پریشانی ہونے لگی۔ ادھر منیر کے دماغ پر خوف سوار تھا۔ اس کی پڑھائی پر بھی برا اثر پڑ رہا تھا۔ وہ جب بھی اپنے ساتھیوں سے کہتا کہ وہ اب اس مذاق کو ختم کریں تو جواب ملتا۔

"یار! پڑھائی میں تو تم زیرو ہو، اب پہلوانی کے میدان میں ہی ہیرو بن جاؤ۔ اب تو یہ لیاقت ہال کی عزت کا معاملہ ہے۔ تمہیں اتنی محنت سے داؤ پیچ سکھائے جا رہے ہیں، پریکٹس کرائی جا رہی ہے۔ اب بیچ میں کیسے چھوڑ دیں تمہیں"۔

منیر تنگ آکر کہتا "خالی داؤ پیچ سیکھ کر یا پریکٹس کر کے بھلا میں کیا کر لوں گا۔ کشتی کے لیے تو جان چاہیے، طاقت چاہیے"۔

جواب ملتا "ارے یار! جان بھی آجائے گی۔ تم حوصلہ رکھو۔ مرے کیوں جاتے ہو۔ اس دن تم ہی تو سب کو شرم دلا رہے تھے۔ بہت بڑھ بڑھ کر بول رہے تھے"۔

منیر رنکھا ہو جاتا اور کہتا "تو میں نے یہ کب کہا تھا کہ مجھے ہی سولی پر چڑھا دو۔ تم سب یہ چاہتے ہو کہ اکھاڑے میں میری قبر بناؤ"۔

سب مل کر کہتے "صرف قبر نہیں بنائیں گے، اس پر چراغ بھی جلائیں گے اور سرہانے پتھر لگے گا جس پر لکھا ہو گا "ہیرو منیر خان جس نے لیاقت ہال کی عزت کے لیے جان دے دی"۔

کچھ اور وقت گزرا اور کشتی کے مقابلوں کے دن قریب آنے لگے۔ منیر بالکل سہما ہوا تھا۔ اس کی طبیعت بڑی گری گری

رہتی تھی۔ آخر ایک دن وہ لڑکوں کی آنکھ بچا کر وارڈن سے ملاقات کے لیے گیا اور اس معاملے میں ان سے مدد چاہی۔ دونوں میں بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وارڈن کو منیر سے بہت ہم دردی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ منیر کا کشتی کے مقابلوں میں شرکت کے لیے نام انہیں ہی بھیجنا ہے۔ وہ نہیں بھیجیں گے تو منیر کو کوئی زبردستی تو ان مقابلوں میں شریک نہیں کرا سکے گا۔ لیکن انہیں یہ بھی اندازہ تھا کہ اس صورت میں لڑکے منیر کا ناک میں دم کر دیں گے اور اس کا منیر کی صحت اور پڑھائی پر برا اثر پڑے گا۔ بلکہ انہوں نے منیر سے ملاقات کے دوران میں محسوس کیا تھا کہ اس کی صحت بگڑنا شروع ہو گئی ہے۔ وارڈن نے منیر کی موجودگی ہی میں اپنے ایک دوست کو فون کیا جو کچھ دن پہلے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے باہر سے آئے تھے اور پھر منیر کو تاکید کی کہ وہ فوراً ان سے ملے۔

اب وہ وقت آن پہنچا جب ہر ہال کے وارڈن کو مختلف مقابلوں میں شرکت کرنے والے لڑکوں کے نام پرنسپل کے دفتر بھیجنا تھے۔ لیاقت ہال کے لڑکوں نے پھر اپنے وارڈن سے اصرار کیا کہ وہ کشتی کے لیے منیر خان کا نام بھیج دیں۔ ابھی وارڈن نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ ایک دن منیر کی چھٹی کی درخواست آگئی اور معلوم ہوا کہ وہ بوعلی سینا ہسپتال میں ڈاکٹر ہاشمی کے زیر علاج ہے۔

اس خبر سے منیر کے ساتھیوں کو مایوسی بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ وہ مذاق ہی مذاق میں واقعی بیمار پڑ گیا۔ سارے لڑکے دل ہی دل میں اس کی صحت کے لیے دعائیں مانگنے لگے اور اپنی باتوں میں بھی وہ اس سے ہم دردی جتاتے۔ البتہ ان سب کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ اس سال بھی کشتی کے مقابلے میں لیاقت ہال کی نمائندگی نہیں ہو سکے گی۔

کالج میں کھیلوں کا ہفتہ شروع ہو گیا۔ مختلف مقابلے ہوتے رہے۔ کشتی میں اس بار آخری مقابلہ اقبال ہال کے جمشید اور سرسید ہال کے شعیب کے درمیان تھا۔ خوب تیاری تھی۔ دونوں طرف بڑا جوش تھا۔ لڑکے پیش گوئیاں کر رہے تھے۔ زیادہ تر لڑکوں کا خیال تھا کہ اس بار شعیب بازی لے جائے گا۔ اور یہی ہوا۔ سخت مقابلے کے بعد شعیب نے جمشید کو پچھاڑ دیا۔ میدان نعروں سے گونج اٹھا۔ لڑکے شعیب کو ہار پہنائے کندھے پر لئے گھوم رہے تھے۔ اتنے میں کسی کی نظر منیر پر پڑی جو اکھاڑے سے کچھ دور ایک درخت کی آڑ میں ذرا سہما کھڑا تھا۔

پھر کیا تھا' ایک نے دوسرے کو بتایا اور سب اس کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک لڑکے نے منیر کو کندھے پر اٹھا لیا اور باقی نعرے لگانے لگے۔ "آگیا بھئی آگیا اصلی ہیرو آگیا"

شور ہنگامہ ختم ہوا تو انعامات تقسیم ہوئے اور پھر پرنسپل صاحب نے تقریر شروع کی۔ انہوں نے جیتنے والوں کو مبارک باد دی اور ہارنے والوں کو حوصلہ دلایا۔ خاص طور سے انہوں نے منیر کا ذکر کیا اور کہا "منیر بڑی محنت سے مقابلے کی تیاری کر رہا تھا لیکن بد قسمتی سے اس کی صحت خراب ہو گئی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ امید ہے کہ وہ آئندہ سال مقابلے میں شریک ہو گا"۔

ایک لڑکا کھڑا ہوا اور اس نے بڑے ادب سے پرنسپل صاحب سے کہا:

"سر! میری ایک تجویز ہے۔ کشتی کا مقابلہ تو ہو چکا انعام بھی تقسیم ہو گئے۔ لیکن کیوں نہ منیر اور تیسرے نمبر پر آنے والے پہلوان کے درمیان دوستانہ مقابلہ ہو جائے۔ ذرا ہم سب کی تفریح ہو جائے گی اور اندازہ بھی ہو جائے گا کہ منیر نے اب تک کیا سیکھا ہے"۔

حاضرین نے خوب تالیاں بجائیں اور اس تجویز کے حق میں نعرے لگائے۔ پرنسپل صاحب نے اس تجویز کو پسند کرتے ہوئے کہا۔

"اگر بچوں کی یہی خوشی ہے تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن پہلے منیر سے تو پوچھ لیا جائے۔ ابھی تو وہ بیماری سے اٹھا ہے"۔

سب کا خیال تھا کہ منیر سخت پریشان ہو گا اور پیچھا چھڑائے گا۔ لیکن جب اس سے پوچھا گیا تو لوگ حیران رہ گئے۔ منیر نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ جب مقابلہ کرنا ہے تو تیسرے نمبر پر آنے والے سے کیوں کیا جائے۔ پہلے نمبر والے سے ہی ہو جائے"۔

یہ کہہ کر منیر اکھاڑے کی طرف بڑھا۔ کچھ لوگ حیرانی سے بالکل خاموش ہو گئے اور کچھ نے زور دار تالیاں بجائیں۔ کچھ نے

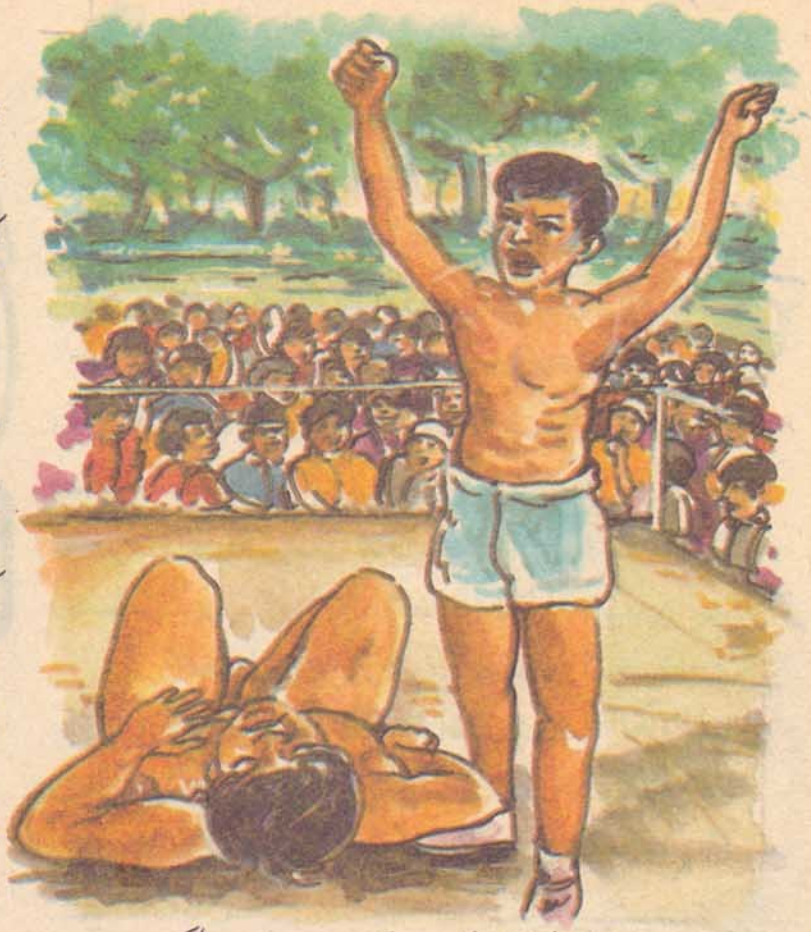

منیر کا دبلا پتلا جسم دیکھ کر فقرے بھی چست کئے۔ لیکن وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اکھاڑے میں اتر کر اپنے مقابل کا انتظار کرنے لگا۔ مقابلہ ہوا اور خوب ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اس وقت ہر طرف سناٹا چھا گیا جب منیر نے اپنے مقابل کو چت کر دیا اور بڑی خاموشی سے اکھاڑے سے باہر نکل آیا۔

سناٹے کے بعد ایک دم جو شور مچا تو پھر کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

"لیاقت ہال کی جان منیر پہلوان' ہماری عزت ہماری شان منیر خان' منیر خان"

لیاقت ہال کے طلبہ منیر کو کندھے پر اٹھائے میدان کے چکر لگائے جا رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے مائیکروفون میں کہا۔

"دوستو! خوشی تو ضرور مناؤ لیکن آخر اس جیت کا راز بھی تو معلوم کرو"۔

دوستوں نے منیر کو اسٹیج پر کھڑا کر دیا اور کہا کہ وہی بتائے کہ کیا ماجرا ہے۔ دوستوں کے اصرار پر منیر نے اپنی کہانی شروع کی۔

"ہوا یوں کہ جب میں ڈاکٹر ہاشمی سے ملا تو انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے کوئی بیماری نہیں' میں صرف خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ ان سے دو تین ملاقاتوں کے بعد میں کافی بہتر محسوس کرنے لگا۔ اس دوران میں ڈاکٹر ہاشمی نے مجھے ایک مشین بھی دکھائی جو برطانوی سائنس دانوں نے بنائی تھی۔ یہ مشین کھلاڑیوں کے لیے بہت کار آمد ہے کیوں کہ یہ اپنے کمپیوٹر کی مدد سے انسانی جسم کے عضلات کا نقشہ تیار کر لیتی ہے اور یہ بتا سکتی ہے کہ جسم کے کون سے عضلات کم زور ہیں اور کون سے مضبوط۔ مشین یہ بھی بتا سکتی ہے کہ کس کھیل میں کن عضلات کو چوٹ پہنچنے کا زیادہ خطرہ رہتا ہے اور ان کی حفاظت کس طرح کی جائے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے مشین کے ذریعے میرے کم زور عضلات کا پتا چلا کر ان کا علاج کیا اور جن عضلات کا کشتی سے براہ راست تعلق ہے انہیں خوب مضبوط بنایا نیز مجھے اپنے عضلات کی حفاظت کی تربیت دی۔

اس مشین کا نام بایوڈکس (Biodex) ہے۔ اس سے ڈاکٹر ہاشمی نے میرا جو علاج کیا اور مجھے جو تربیت دی اس کا ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ مجھے جب یقین ہو گیا کہ میرے عضلات خوب مضبوط ہو گئے ہیں اور اب میں آسانی سے چوٹ نہیں کھا سکتا تو مجھ میں اعتماد بھی پیدا ہو گیا اور پھر میں خوب بے جگری سے کشتی لڑا۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ مشین 20ویں صدی کے بالکل آخری برسوں میں یورپ میں تجرباتی طور پر استعمال کی گئی تھی۔ اب 5 سال گزرنے کے بعد یعنی 2004ء میں یہ ہمارے ملک تک پہنچ چکی ہے اور ہر جگہ اس کے تجربے کام یاب رہے ہیں۔ دنیا بھر کے کھلاڑی یقیناً اس ایجاد سے خوب فائدہ اٹھائیں گے۔ اس چار پانچ سال کے عرصے میں مشین کی کارکردگی کو بہتر بنایا گیا ہے اور کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ عضلات کو اتنا مضبوط بنا دیا جائے کہ وہ انسان کو بہت سے حادثات سے بھی محفوظ رکھ سکیں"۔

منیر ابھی یہاں تک ہی پہنچا تھا کہ دوستوں نے اسے پھر کندھے پر اٹھا لیا اور فضا نعروں سے گونجنے لگی۔

"آگیا بھئی آگیا مشینی پہلوان آگیا' سب کے دل کو بھا گیا سب ہالوں پر چھا گیا"

آپ بھی لکھیے

اور وہ پکڑا گیا

رومانہ رشید، چیچاوطنی

ماموں جان چھٹیوں میں ملنے آئے تو بہت سے دوسرے پروگراموں کے ساتھ خریداری کا پروگرام بھی بنا۔ آئمہ تو سن کر بہت خوش ہوئی۔ خریداری کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں رنگ برنگی چیزوں کا تصور آگیا۔ جس دن آئمہ کو اسکول سے ایک فنکشن کی تیاری کے سلسلے میں چھٹی تھی، اس دن سب لوگ خریداری کے لیے چل پڑے۔ آئمہ کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

یہ اس شہر کا بہت خوب صورت شاپنگ پلازہ تھا عموماً اس طرح کے بڑے بڑے پلازوں میں سیکیورٹی کا نظام بہت سخت ہوتا ہے۔ یہاں بھی داخلی دروازے پر ہی سیکیورٹی گارڈ نے ایک خصوصی آلے کے ذریعے ان کی چیکنگ کی۔ آئمہ تھوڑی گھبرا گئی۔ اسی اثنا میں ایک اور آدمی بھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا بریف کیس تھا۔ دیکھنے میں وہ دوسرے خریداروں ہی کی طرح لگ رہا تھا۔ جب سیکیورٹی گارڈ آلے کے ذریعے اس کی تلاشی لینے لگا تو اس نے کمال ہوشیاری سے وہ بریف کیس تھوڑا سا سائیڈ پر رکھ دیا۔ دیکھنے والے کو یہی گمان ہوا کہ وہ بریف کیس رکھ کر اپنی جیب سے کچھ نکالنے لگا ہے۔

آئمہ یہ سب بغور دیکھ رہی تھی۔ جب وہ سیکیورٹی والے عملے سے گزر گیا تو آئمہ نے عفان کو کہنی ماری۔

"کیا ہے؟" عفان بھائی جھنجھلا کر بولے۔

"عفان بھائی، اس آدمی نے اپنے اس بریف کیس کی تلاشی نہیں دلوائی" وہ بولی تو سرگوشی والے انداز میں تھی مگر وہ آدمی پلٹ کر دیکھنے لگا۔ لیکن اس نے آئمہ کو بچی سمجھ کر نوٹس نہ لیا اور آگے چل پڑا۔

"کون؟" عفان بھائی کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بولے۔

"افوہ بھائی، وہ جو ابھی مڑ کر دیکھ رہا تھا"

"تم براہ مہربانی یہ جاسوسی ناول پڑھنے کم کر دو" عفان بھائی نے مذاق اڑایا۔

"نہیں بھائی، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے اس پہ شک ہے" وہ تلملائی۔

"ارے نہیں، ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ فکر نہ کرو، یہاں سیکیورٹی کا نظام بہت سخت ہے" عفان نے اسے تسلی دی لیکن وہ مطمئن نہ ہوئی۔ پھر سارے خریداری کرنے لگے۔ مگر اس کے ذہن سے ابھی تک یہ بات نہ نکل سکی تھی۔ جب وہ بوتیک والے پورشن میں آئے تو آئمہ کو ایک سوٹ اس قدر پسند آیا کہ اس نے اسے فوراً خریدنا چاہا۔ سوٹ پیک کروا کر ماموں بل کی ادائیگی کر رہے تھے کہ وہی آدمی جس کو آئمہ نے داخلی گیٹ پر دیکھا تھا اسے وہاں بھی نظر آیا۔ وہ بریف کیس ہنوز اس کے ہاتھ میں تھا۔ یکایک اس نے ادھر ادھر دیکھا اور بریف کیس وہیں رکھ کر وہاں سے سیدھا نکل گیا۔ آئمہ فوراً اس کے پیچھے لپکی "انکل آپ کا بریف کیس"

وہ شخص پلٹا۔ اسے اپنی سیاہ عینک کے پیچھے سے گھورا اور سنی ان سنی کرتے ہوئے وہاں سے کہیں اور چلا گیا۔ آئمہ واپس ماموں اور عفان بھائی کے ساتھ آملی۔ "عفان بھائی!"

"اب کیا ہے؟" عفان بھائی کو اس کا بار بار ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"دیکھیں وہ شخص اپنا بریف کیس وہیں رکھ گیا ہے"

"بابا وہ بھول گیا ہوگا" عفان نے کہا۔

"نہیں، وہ بھولا نہیں بلکہ جان بوجھ کر یہاں رکھ کر گیا ہے" آئمہ پر یقین لہجے میں کہہ رہی تھی "آئیں منیجر کو بتاتے ہیں۔ وہ خود نمٹ لے گا"

"کوئی ضرورت نہیں، الٹا ہم ہی دھر لیے جائیں گے" عفان بھائی نے تنبیہ کی۔ آئمہ کو سخت غصہ آیا۔ عفان بھائی اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے تھے۔ جب کہ ماموں دھڑا دھڑ خریداری کر رہے تھے۔ واپسی پہ بھی سارا راستہ یہی بات اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی کہ اگر اس کے اندر کوئی ایسی ویسی خطرناک چیز ہوئی تو۔

گھر آکر عفان بھائی اور ماموں اپنی خریدی ہوئی چیزیں امی اور ابو کو دکھا رہے تھے جب کہ وہ کوئی دل چسپی نہ لے رہی تھی۔ بس ہوں ہاں ہی کر رہی تھی۔ صرف ابو نے نوٹس لیا۔

"کیا بات ہے بیٹا تم دل چسپی نہیں لے رہیں اور تم نے خریداری بھی کچھ خاص نہیں کی؟"

"حال آں کہ یہ ناممکنات میں سے ہے" عفان بھائی چہک کر بولے۔

"دراصل ابو، میں بہت پریشان ہوں" اس کے ساتھ ہی اس نے سارا واقعہ کہ سنایا۔

"یہ واقعی ہے تو پریشانی کی بات مگر بیٹا، اب کیا ہو سکتا ہے؟ خاصا وقت گزر گیا ہے۔ اب تو بہتری کی دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ ابو پر سوچ انداز میں بولے۔ اسی دم ماموں نے بڑھ کر ٹی وی آن کر دیا۔ خبرنامہ آرہا تھا۔

"آج شہر کے سب سے بڑے شاپنگ پلازے میں ایک شخص تخریب کاری کرتے ہوئے پکڑا گیا"

سب لوگ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ساری خبر سن کر تو آئمہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دراصل ہوا یوں تھا کہ جب وہ شخص اپنا بریف کیس رکھ کر غائب ہونا چاہتا تھا تو تب نہ صرف آئمہ دیکھ رہی تھی بلکہ پلازے کے عملے کا ایک رکن بھی اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ کیوں کہ اتنے بڑے پلازے میں سیکیورٹی کا نظام داخلی گیٹ پر ہی نہیں بلکہ سیکیورٹی کا عملہ سادہ کپڑوں میں جگہ جگہ موجود ہوتا ہے۔ بہر حال خدا کا شکر کہ اس کا یہ گھناؤنا منصوبہ انجام سے پہلے ہی فنا ہو گیا۔ آئمہ اب سوچ رہی تھی کہ بریف کیس میں ٹائم فکسڈ بم تھا۔ اگر وہ خدانخواستہ پھٹ جاتا تو کتنا جانی اور مالی نقصان ہوتا۔ اور اگر ایسا ہوتا تو وہ کبھی بھی خود کو معاف نہ کر پاتی (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

انمول نسخہ

محمد عثمان نظر، فیصل آباد

شدید قحط کی وجہ سے بستی پر ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ قحط کو شروع ہوئے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہونے کو تھا۔ اب تو لوگوں کے پاس کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ذخیرہ شدہ اشیا ختم ہو چکی تھیں۔ خشک سالی تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ فصلیں وغیرہ تباہ ہو گئیں۔ پالتو جانور بھی انہیں چھوڑ کر نجانے کہاں نکل گئے۔

اردگرد پھیلے طویل و عریض صحراؤں کے درمیان یہ ایک بڑا نخلستان تھا۔ وہاں کے لوگ تھوڑے سے رقبے پر کاشت کاری کرتے تھے یا پھر بھیڑ بکریاں پالتے تھے۔ یہی ان کی گزر اوقات تھی۔

ایک شام تمام بستی والے آیندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے جمع ہوئے تو رامو بابا جو کہ بستی کا معمر ترین شخص تھا، ان سے مخاطب ہوا:

"بستی والو! جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ اگر مزید کچھ عرصہ بارش نہ ہوئی تو جو پتے اور گھاس وغیرہ کھا کر ہم زندہ ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے ہجرت کر جانی چاہیے۔ مگر میلوں تک پھیلے اس صحرا کو عبور کرنا آسان نہیں۔ خاص کر بغیر سامان خورونوش کے تو یہ بالکل ناممکن ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بارش کے لیے خدا سے ہر روز خصوصی دعا کریں۔ شاید ہماری دعا قبول ہو جائے"۔

سب بستی والوں کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ اب وہ ہر شام ایک جگہ اکٹھے ہوتے اور بارش کے لیے اجتماعی دعا کرتے۔ ایک ماہ اور گزر گیا مگر بارش نہ ہوئی۔

ایک روز جب سب لوگ معمول کے مطابق دعا مانگنے میں مصروف تھے تو اچانک انہیں دور سے کوئی شخص آتا دکھائی دیا۔ شکل اور حلیے سے وہ کوئی بھولا بھٹکا مسافر دکھائی دیتا تھا۔ سب بستی والے اسی جانب چل دیئے۔

"آپ کون ہیں؟ اور یہاں کیسے آئے ہیں؟" قریب پہنچتے ہی ان میں سے ایک نے کہا۔

"میں ایک مسافر ہوں۔ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر ادھر آنکلا ہوں۔ کیا مجھے ایک دو روز یہاں رہنے کی اجازت مل سکتی ہے؟" اجنبی نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"آپ یہاں رہ کر کیا کریں گے؟ یہاں نہ کھانے کے لیے کوئی معقول غذا ہے نہ پینے کے لیے صاف پانی۔ خشک سالی کی وجہ سے سب کچھ ختم ہو چکا ہے" دوسرا بولا۔

"تو کیا آپ لوگ اللہ سے بارش کی دعا نہیں مانگتے؟ وہ تو اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے" اجنبی نے کہا۔

"ہاں کہتے تو آپ سچ ہیں مگر شاید انجانے میں ہم سے کوئی ایسی غلطی ہو گئی ہو جو معافی کے قابل نہیں یا پھر دعاؤں میں ہی اثر نہیں رہا۔ دعا تو ہم ہر روز کرتے ہیں" اس بار راموبابا نے بستی والوں کی نمایندگی کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا" مسافر نے تعجب سے کہا۔ پھر اس نے بستی پر ایک نظر ڈالی۔ وہ کچھ دیر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے بستی والوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ واقعی بارش نہ ہونے کی تمام تر ذمہ داری آپ لوگوں پر ہی ہے"

"کیا؟" وہ حیرت سے چلائے۔

"کل صبح سویرے سب ایک جگہ اکٹھے ہوں۔ پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ بارش نہ ہونے کی اصل وجہ کیا ہے"۔

اگلے دن جب سب لوگ ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تو اجنبی نے کہنا شروع کیا:

"لوگو! اللہ بہت مہربان ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو کتنی زیادہ نعمتیں عطا کی ہیں۔ انہی نعمتوں میں ایک بارش ہے جس کے لیے آپ ہر روز دعا کرتے ہیں۔ آپ سب دعا تو کرتے ہیں مگر آپ کو دعا کی قبولیت پر یقین ہی نہیں"۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" راموبابا جلدی سے بولا۔

"اس بات کا اندازہ مجھے تب ہوا جب میں نے آپ کی بستی کو دیکھا۔ یہاں کوئی جھونپڑی ایسی نہیں جو مرمت طلب نہ ہو۔ سبھی خستہ حال ہیں۔ ایک طرف تو آپ بارش مانگ رہے ہیں دوسری طرف بارش سے بچنے کے لیے انتظامات بھی نہیں کرتے۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ آپ کو دعا کی قبولیت پر یقین ہی نہیں۔ یاد رکھیں! دعا اگر سچے دل اور پختہ یقین کے ساتھ کی جائے تو دعا ہوتی ہے۔ ورنہ بے جان الفاظ سے زیادہ کچھ بھی نہیں"۔

سب بستی والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ اب وہ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ایک ہفتہ تک انہوں نے اپنا کام ختم کر لیا۔ اب کوئی چیز ایسی نہ تھی کہ بارش سے اسے نقصان پہنچے۔ اس کے بعد انہوں نے سچے دل سے بارش کے لیے دعا مانگی اور پھر ایک دن بادل گھر آئے اور خوب بارش ہوئی۔ سب بستی والے بہت خوش تھے۔ دعا کی قبولیت کا نسخہ ان کے ہاتھ لگ چکا تھا.... اور وہ تھا: "دعا سے پہلے دعا پر یقین" (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

ففٹی ففٹی

حمیرا سلطان منہاس، اسلام آباد

"چلو اٹھو زارا بیٹے! رات کافی ہو گئی ہے کہانی صبح مکمل کر لینا"

"امی اٹھ تو میں جاؤں گی" زارا نے جماہی کے بعد بات دوبارہ شروع کی "لیکن میں کہانی تو نہیں لکھ رہی۔ کہانی لکھنا تو میں نے چھوڑ دی"۔ زارا نے اداسی اور بے زاری سے کہا۔

"چھوڑ دی! مگر وہ کیوں بیٹا جانی" زارا کی امی نے محبت اور پریشانی

کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

"چھپتی تو ہے نہیں، پھر کیا ضرورت بلاوجہ سر اور جان کھپانے کی" زارا نے کسی پروفیسر کی طرح دلیل پیش کی۔

"اچھا چلیں، ابھی سو جائیں صبح بات ہو گی" زارا کی امی نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

زارا 13 سال کی گول مٹول سی بچی تھی۔ ذہین اور محنتی تو وہ تھی مگر لاپروائی اور جلد بازی میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نتائج اس کی توقع کے برعکس آتے تھے اور اس کے بعد وہ دل ہار کر اور منہ بسور کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس کی اسی عادت کے باعث اس کی امی باقی بچوں کی نسبت زارا پر زیادہ توجہ دیتی تھیں۔ سالانہ امتحان سے پہلے ہونے والے کلاس ٹسٹ میں بھی یہی ہوا تھا۔ رزلٹ دیکھ کر وہ بالکل ہی سست پڑ گئی تھی۔ کیوں کہ اس کی کوئی پوزیشن نہیں آئی تھی۔

اس رات بھی یہی ہوا تھا۔ اصل میں زارا کی امی کو خود بچپن سے کہانیاں لکھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ وہ اب بھی کسی نہ کسی رسالے میں وقت ملنے پر ضرور کہانی بھیجتی تھیں۔ ان کا یہ شوق شاید موروثی طور پر ان کے بچوں کو بھی عطا ہوا تھا۔ زارا بھی ہر دوسرے تیسرے ماہ کہانی بھیجتی اور اپنی لاپروائی اور جلد بازی کے باعث اسے ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔

صبح زارا اسکول چلی گئی تو کام کرنے کے بعد جب اس کی امی زارا کے کمرے میں گئیں تو انہیں زارا کی مطالعہ کی میز کے نیچے دو تین مڑے تڑے کاغذ نظر آئے۔ دیکھا تو اندر کوئی کہانی لکھی ہوئی تھی۔ لکھائی اتنی گندی تھی کہ زارا کی امی کو تو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ آخر بہت کوشش کے بعد انہوں نے پڑھنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ عمر کے مطابق کہانی کا خیال اور پلاٹ تو اچھا تھا لیکن اب انہیں اپنی بیٹی کی کمزوری کا پتا چل گیا تھا۔

اسکول سے واپس آکر حسب معمول زارا کپڑے بدل کر اور نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر سو گئی۔ اٹھ کر کھیلنے ہی لگی تھی کہ امی نے لسٹ تھما کر بازار سے کچھ لانے کو کہا۔

"امی، یہ آپ نے کیا لکھا ہے کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا" زارا نے الجھن سے کہا۔

"اچھا خیر چھوڑو اس کو، چلو پہلے ہوم ورک کر لیں" زارا کی امی اسے کمرے میں لے گئیں۔

"زارا بیٹا" امی نے کرسی میں بیٹھتے ہوئے کہا "ابھی جو میں نے لسٹ دی تھی وہ آپ کو کیوں سمجھ میں نہیں آئی؟"

"امی اس میں لکھائی بہت گندی تھی اور جگہ جگہ کٹنگ بھی کی ہوئی تھی" زارا نے کہا۔

"اچھا بیٹا! اس کہانی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ کسی کو سمجھ میں آجائے گی؟" امی نے کہانی کا وہی صفحہ زارا کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

زارا نے اپنی کہانی کو لکھنے کے بعد پہلی مرتبہ پڑھنے کی کوشش کی "یہ تو سمجھ میں ہی نہیں آرہی" زارا نے سر کھجایا۔

"تو بیٹا، جب آپ کو اپنی لکھی ہوئی تحریر سمجھ میں نہیں آرہی تو رسالے کے اڈیٹر انکل کو کیسے سمجھ میں آئے گی؟ انہیں بھی تو کہانی چھاپنے سے پہلے پڑھنی ہوتی ہے نا۔ کہانی لکھنے کا سنہری اصول یہ ہے کہ آپ خوش خط اور صاف صاف لکھیں۔ شاید آپ اسی گندی لکھائی کی وجہ سے پڑھائی میں بھی اکثر پیچھے رہ جاتی ہیں"۔

زارا اپنی امی کی باتیں بغور سن رہی تھی۔ زارا کی امی نے اسی پیار سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "چلو بیٹا! یہی کہانی آپ صاف ستھری لکھ کر پہلے چیک کراؤ پھر اسے پوسٹ کرنا"

اب کی بار زارا نے واقعی کمال کر دیا تھا۔ کہانی واقعی بہت خوش نما لگ رہی تھی۔ زارا کی امی نے خود زارا کے ساتھ جا کر اسے پوسٹ کیا اور اب دونوں کو انتظار تھا اگلے شمارے کا۔ جب ہاکر شمارہ دے کر گیا تو زارا نے فوراً کھولا۔ پھر "یاہو" کا نعرہ لگا کر امی کے پاس باورچی خانے میں دوڑی آئی "امی دیکھیں میری کہانی چھپ گئی ہے۔ تھینک یو امی" زارا نے امی کے گرد باہیں ڈال کر کہا۔ زارا کی امی اپنی بیٹی کی معصومیت اور کامیابی پر بے انتہا خوش نظر آرہی تھیں۔ بلکہ یہ کامیابی تو ان دونوں کی مشترکہ تھی، یعنی ففٹی ففٹی (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

ایک تقریر

ذی شان صدیق' لاہور

ساتھیو' 21اپریل 2000ء بروز جمعہ ہمارے اسکول میں حکیم الامت شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا62واں یوم وفات منایا گیا۔ جس میں مجھے علامہ اقبال اور ان کا فلسفہ خودی کے موضوع پر تقریر کرنا تھی۔ میں نے اس موضوع پر جو تقریر کی اسے نہ صرف سامعین نے بہت پسند کیا بلکہ مجھے اس پر اول انعام بھی ملا۔ میں یہ تقریر تعلیم و تربیت کے ذریعے آپ تک پہنچا رہا ہوں۔

صاحب صدر اور معزز سامعین: اقبال نے زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی شاعری ہر موضوع کا احاطہ کیے ہوئے ہے لیکن ان کی شاعری کا سب سے روشن پہلو ان کا فلسفہ خودی ہے۔ خودی کا لفظ مختصر لیکن نہایت جامع ہے۔ علامہ اقبال نے اس اصطلاح کو اپنے تمام کلام میں ذات کی پہچان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ خودی جہاں اقبال کے تمام افکار کا مرکز و محور ہے وہاں ان کے فکری اور سیاسی انقلاب انگیز پیغام کی اساس بھی یہی نظریہ ہے۔ خودی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے علامہ اقبال اسے "کتاب" اور باقی تمام نظام حیات کو اس کی "تفسیریں" قرار دیتے ہیں۔

خودی سے مرد خود آگاہ کا جلال و جمال
کہ یہ کتاب ہے' باقی تمام تفسیریں

علامہ اقبال برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ روئے زمین کے تمام مسلمانوں کو ان کی کھوئی ہوئی عزت' رفعت اور عظمت واپس دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کا کہنا ہے کہ مسلمان صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب وہ جہد مسلسل سے کام لیں۔ اقبال مرد مومن کے متلاشی ہیں۔ ایسا مرد حق آگاہ جو اسلام کا حقیقی وارث ہو اور خودی کا چراغ جلا کر جہالت کے اندھیروں کو دور کر سکے۔ اقبال نے مسلمانوں کو بیداری کا درس دیتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا۔

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری' نہ میری ضرب ہے کاری

اقبال قبیلوں' نسلوں اور فرقوں کے تصور کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ تونیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرونے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں۔

یوں تو سید بھی ہو' مرزا بھی ہو' افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اقبال کے نزدیک انفرادیت اہم ہے لیکن اجتماعیت کی ضرورت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ فلسفہ خودی کے علم بردار ہیں لیکن افراد کے لیے اجتماعی زندگی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے' تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

نوجوان کسی بھی قوم کی تقدیر بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اقبال نے نوجوانوں کو شاہین کی طرح آزاد اور باوقار ہونے کا سبق دیا ہے۔ خودی کی زندگی سخت کوشی سے عبارت ہے اور محنت مشقت اس کا بنیادی تقاضا ہے۔ زندہ قومیں اپنی تقدیر خود بناتی ہیں۔ یہی سرّ آدم ہے اور یہی ضمیر کن فکاں ہے

(چوتھا انعام: 70روپے کی کتابیں)

دل دل پاکستان

احد عزیز' جلالپور جٹاں

"میں امریکا ضرور جاؤں گا" یہ آواز عمر کی تھی۔ اس کے والدین نے اسے سمجھایا کہ اپنے وطن کی سی محبت کہیں نہیں مل سکتی۔ لیکن عمر ہمیشہ یہی کہتا "اس ملک میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہر طرف بے روزگاری اور بے ایمانی ہے۔ مجھے اس معاشرے میں گھٹن محسوس ہوتی ہے"۔

پھر عمر نے سارے انتظامات مکمل کیے اور روانہ ہو گیا۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوائی اڈے کی طرف جارہا تھا کہ ڈرائیور نے اس سے پوچھا "جناب! کیا آپ باہر جارہے ہیں؟"

"ہاں بھئی، اس ملک میں رکھا ہی کیا ہے جو میں یہاں رہوں" عمر نے جواب دیا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "میں ایف اے پاس ہوں اور ٹیکسی چلاتا ہوں صاحب! یہ مٹی ہماری جان ہے اور ہم اس کی خدمت کرنے کے بجائے کسی دوسرے ملک کی خدمت کرتے ہیں۔ جب ہمارے ڈاکٹر اور انجینئر باہر چلے جائیں گے تو اس ملک کی خدمت کون کرے گا؟ مجھے ملازمت نہیں ملی لیکن میں نے باہر جانے کے بجائے وطن کی خدمت کی۔ آج میں حلال کی روزی کماتا ہوں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ملک ترقی نہیں کرتا، لیکن جب ہم جیسے ہنر مند لوگ باہر چلے جائیں گے تو اس وطن کی خدمت کون کرے گا؟ ہمارے شہیدوں اور غازیوں نے کیا اسی لیے قربانیاں دی تھیں کہ ہم اپنا فرض بھول جائیں؟ آج بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔ آخر کیوں؟ کیوں کہ ہم میں اتحاد نہیں۔ ہمیں چاہیے صاحب کہ مل جل کر محنت کریں اور اس ملک کی ترقی کے لیے کام کریں۔ وہ دن دور نہیں جب ہم ایک مضبوط قوم بن جائیں گے؟"

پھر ڈرائیور کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کا ایک ایک لفظ عمر کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ اسی دوران میں ڈرائیور نے کہا "صاحب! ہوائی اڈا آگیا ہے"

عمر نے اس کی طرف دیکھا اور کہا "واپس چلو میں نے امریکا نہیں جانا، میں روکھی سوکھی کھا کر بھی اپنے ملک کی خدمت کروں گا۔ یہ تو میرا دل ہے، میری جان ہے۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیور نے تیزی سے ٹیکسی واپس موڑ دی (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

شرارت کی سزا

حمیرا بی بی احمد، اوسلو ناروے

حامد بہت شریر بچہ تھا۔ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا تھا۔ کبھی بہن کی کاپی پھاڑ دی تو کبھی گھر کی کوئی چیز خراب کر دی۔ اس کے امی ابو نے اسے کئی بار سمجھایا کہ گھر کی چیزوں کو خراب نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ہر وقت شرارت سے اسے بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس نے اپنی عادت نہ چھوڑی۔

ایک دن حامد کی امی صحن کی صفائی کر رہی تھیں۔ حامد کمرے میں کھیل رہا تھا۔ اسے شرارت سوجھی۔ وہ اسٹول پر چڑھ کر چھلانگیں لگانے لگا۔ اس کی امی نے آکر اسے روکا مگر وہ باز نہ آیا۔ وہ چھلانگیں لگا رہا تھا کہ ایک دم اسٹول پھسل گیا۔ حامد فرش پر گر پڑا۔ اس کے پاؤں میں موچ آگئی اور وہ درد سے رونے لگا۔ حامد کی امی دوڑتی ہوئی آئیں۔ انہوں نے حامد کو اٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ ڈاکٹر نے حامد کے پاؤں پر پٹی باندھی اور اسے چلنے پھرنے سے روک دیا۔ اب حامد بستر پر پڑا تھا۔ حامد کی امی اس کے پاس آبیٹھیں اور اس سے کہا۔ "حامد بیٹا! میں نے تمہیں کئی بار سمجھایا کہ شرارت نہ کیا کرو۔ مگر تم نے میرا کہنا نہیں مانا۔ اب تم کئی دن تک چل پھر نہیں سکو گے۔ تمہاری پڑھائی کا بھی حرج ہو گا۔ تم کھیل بھی نہیں سکو گے"۔

حامد نے اپنی امی کی باتیں غور سے سنیں اور اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ کبھی بھی شرارت نہیں کرے گا (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

DRAWING

ڈرائنگ

تعلیم کے گراف کو بلندیوں تک لے جاسکتی ہے

محمود حسن رومی

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور، راولپنڈی، کراچی

سنی سنائی

زبیدہ سلطانہ

تین قسمتی سپاہی

پرانے وقتوں میں تو سفر کے لیے اس دور جیسی سہولتیں میسر نہ تھیں۔ لوگ اونٹ، گھوڑے وغیرہ کی سواری کرتے یا بیل گاڑیوں، اونٹوں رتھوں اور بہلیوں وغیرہ پر سفر کرتے۔ بعض گھنے جنگلوں کے علاقوں میں تو ان سواریوں پر سفر ممکن نہ ہوتا تو بے چارے مسافر پاپیادہ ہی دور دراز علاقوں میں مہینوں بھر چل کر اپنی منزل پر پہنچتے۔

یہ کہانی بھی اسی زمانے کے ایک فوجی سپاہی کی ہے جو کئی سال بعد چھٹی پر آیا تو اپنے گھر کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اس کا گاؤں ایک بہت لمبے چوڑے گھنے جنگل کے اس پار واقع تھا۔ جہاں سے کوئی سواری نہیں گزر سکتی تھی۔ لوگ پیدل ہی آتے جاتے تھے۔ درختوں کی گھنی شاخیں آپس میں یوں گندھی ہوئی تھیں کہ راستہ بنانا دشوار تھا۔

ہاں تو ذکر اس سپاہی کا تھا جو کئی سال بعد چھٹی پر آیا تھا اور اب جنگل میں سے گزر کر اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ سنسان جنگل، سائیں سائیں کرتا مہیب سناٹا! گھنی خاردار جھاڑیاں اونچی گھاس اور الجھی ہوئی بیلوں سے پٹے ہوئے راستے۔ درخت اس قدر گھتے ہوئے کہ سورج کی کرنیں چھن کر زمین تک نہ آسکیں۔ ایسے میں بے چارے سپاہی کے دل میں ہول اٹھنے لگا۔ سپاہی تھا تو کیا، آخر انسان ہی تھا۔ بہت خوف زدہ ہوا۔ مگر کیا کرتا گھر بھی تو پہنچنا تھا۔ اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔

خوش قسمتی تھی کہ اگلے دوراہے پر اسے ایک بزرگ مل گئے۔ لمبی سفید ڈاڑھی، نورانی چہرہ، ٹخنوں تک لمبا جبہ پہنے ہوئے تھے۔ سر پر سفید عمامہ تھا۔ سپاہی بہت خوش ہوا۔ آگے بڑھ کر سلام کیا اور پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ انہوں نے کسی قریبی گاؤں کا نام لیا جو سپاہی کے راستے میں پڑتا تھا۔ خیر یہ بھی غنیمت تھا۔ اس نے سوچا اتنا راستہ تو کٹے آگے بھی اللہ مالک ہے۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ وہ بزرگ چپ چاپ چلے جا رہے تھے کہ سپاہی بولا:

"حضرت! کوئی بات کیجئے کہ سفر کٹے؟"

"تو کمائی کر کے آرہا ہے، بوڑھے کی کچھ خدمت کر تو بوڑھا بھی کوئی بات کرے" بزرگ بولے۔

سپاہی نے جیب سے کچھ رقم نکال کر پیش کی تو بزرگ نے کہا۔

"ہم سفر کو جانچ پرکھ کر چھان پھٹک کر ساتھ اختیار کر...."

اتنی سی بات کہہ کر بزرگ نے پھر چپ سادھ لی۔ جنگل کا سناٹا، اندھیرا، خوف ناک ماحول، سپاہی کا دل گھبرانے لگا۔ وہ پھر

بولا "حضرت کوئی بات کیجئے کہ پندھ کٹے....."

بزرگ نے خاموشی سے مسکرا کر ہاتھ آگے پھیلا دیا۔ گویا مزید رقم کا مطالبہ تھا۔ سپاہی نے پھر کچھ روپے نکال کر نذر کئے تو باباجی نے فرمایا:

"کسی لمبے گھنگٹ والی کا اعتبار نہ کرنا.....!"

اتنا کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گئے۔ سپاہی ان کے مزید کچھ کہنے کا انتظار کر کر کے تھک گیا آخر پھر بولا:

"باباجی! کوئی بات کریں کہ سفر کٹے"۔

باباجی نے حسب عادت پھر ہتھیلی پھیلا دی۔ سپاہی نے پھر کچھ رقم نکال کر پیش کی تو باباجی بولے:

"ہر کام کرنے سے پہلے تین بار اس پر غور کر لیا کر!"

اور اگلے ہی موڑ پر وہ اپنے راستے پر ہو لیے۔ سپاہی پھر اکیلا رہ گیا۔ وہ دل میں اپنی حماقت پر جھنجھلا اٹھا کہ وہ خواہ مخواہ بوڑھے سے متاثر ہو کر اپنا اتنا روپیہ گنوا بیٹھا۔ تین بے کار سی باتیں کر کے وہ اسے لوٹ لے گیا!

اتنے ہی میں وہ ایک دوراہے پر پہنچا تو آگے ایک شخص چلا جا رہا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھا کر اس کے ساتھ جا ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ چند میل آگے کسی آبادی تک جا رہا ہے۔ شکل و صورت سے وہ کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا تھا۔ اس نے عجیب عیار جیسی نظروں سے سپاہی کا جائزہ لیا پھر اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ ملازمت سے چھٹی پر آ رہا ہے تو ضرور کافی رقم اس کے پاس ہو گی۔

وہ آدمی بار بار سپاہی سے چند قدم پیچھے رہ جاتا۔ سپاہی چلتے چلتے رک جاتا کہ وہ ساتھ آ ملے۔ سپاہی دل ہی دل میں اس شخص سے گریز بھی کر رہا تھا لیکن ساتھ چلنے پر مجبور بھی تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں درختوں کے جھنڈ کچھ زیادہ گھنے نہیں تھے اور دھوپ زمین تک پہنچ رہی تھی۔ اس بار وہ اجنبی شخص سپاہی سے پیچھے رہ گیا تو سپاہی نے چوکس ہو کر چلنا شروع کیا۔ اچانک اس کی نگاہ زمین پر پڑنے والے سائے کی طرف اٹھی۔ وہ آدمی اپنی ڈب سے کچھ نکال رہا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ میں ٹکوا جیسا کوئی ہتھیار نظر آیا جو اس نے آگے بڑھ کر سپاہی کے سر پر مارنا چاہا لیکن سپاہی بھی خبردار ہو چکا تھا۔ اس نے جھٹ پینترا بدلا اور اپنی بندوق اس کی کن پٹی کے ساتھ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے فائر کی آواز سناٹے میں گونجی اور وہ شخص زمین پر دراز ہو گیا۔ اب سپاہی کو بزرگ کی پہلی نصیحت یاد آئی کہ "ہم سفر جانچ پرکھ کر اختیار کرو"۔

شام کافی گہری ہو رہی تھی کہ سپاہی کسی آبادی کے قریب پہنچ گیا۔ ایک عورت کنوئیں سے پانی بھر کر گھڑا اٹھائے جا رہی تھی۔ سپاہی نے سوچا رات کو سفر کرنا ممکن نہیں اس لیے رات اس آبادی میں ٹھہر جانا چاہیے۔ اسی غرض سے وہ عورت کے قریب پہنچا اور کہا "بہن! میں مسافر ہوں رات سر پر ہے۔ چاہتا ہوں رات اس گاؤں میں گزار لوں۔ کیا کہیں رہنے کا ٹھکانا مل سکتا ہے"۔

اس کی بات کا جواب دینے کے لیے عورت نے ذرا سا رخ پھیرا تو سپاہی نے دیکھا کہ اس نے لمبا سا گھنگٹ نکال رکھا ہے۔ لمحہ بھر کو وہ چونکا۔ اسے بزرگ کی بات یاد آئی مگر کہتے ہیں نا کہ حاجت مند دیوانہ ہوتا ہے۔ اسے رات کے ٹھکانے کی فکر تھی۔ چناں چہ فوراً ہی بزرگ کی بات اس نے ذہن سے جھٹک دی۔ عورت کہہ رہی تھی۔

"مسافر ہو تو چلے آؤ میرے پیچھے۔ اگر میرے شوہر نے اجازت دے دی تو رہ جانا ہمارے ہاں۔ ورنہ کسی اور گھر میں تمہارا انتظام کر دیں گے"۔

یہ سیدھا سا جواب تھا۔ عورت شریف معلوم ہوتی تھی کہ اپنے شوہر کی مرضی کی پابند تھی۔ سپاہی نے قیاس دوڑایا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ عورت راستہ میں پھر کچھ نہ بولی۔ سپاہی کے نزدیک یہ بھی اس کی شرافت اور پارسائی کی علامت تھی۔ گھر پہنچ کر عورت نے گھڑا ایک طرف رکھا اور اسے ایک کوٹھڑی میں بٹھا کر چلی گئی۔ کافی دیر بعد وہ اس کے لیے کھانا لے کر آئی اور بتایا کہ وہ رات کو اسی جگہ سو سکتا ہے۔ سپاہی کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹ گیا مگر اس نے ارادہ کر لیا کہ غافل ہو کر نہیں سوئے گا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی کہ وہ کسی آواز پر

چوکنا ہوا۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی اوٹ سے دیکھا کہ عورت چراغ لیے پاس کھڑی ہے اور ایک مرد کدال سے زمین میں گڑھا کھود رہا ہے۔ ”بس اتنا کافی ہوگا؟“ مرد نے پوچھا۔

”نہیں ذرا اور گہرا کھودو‘ دیکھا نہیں وہ کتنا لمبا چوڑا آدمی ہے“ عورت بولی۔ سپاہی سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہے اور چپ چاپ لیٹ کر سوتا بن گیا۔ وقت آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔ کافی دیر بعد پہلے عورت کمرے میں آئی اور اس کی پائینتی کی طرف کھڑی ہو گئی۔ جب تسلی ہو گئی کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے تو دروازے سے جھانک کر سرگوشی میں بولی:

”بے سدھ سویا پڑا ہے جلدی کر“

یہ سن کر مرد کمرے میں آیا۔ اب اندھیرے میں دو ہیولے اس کی پائینتی کی طرف موجود تھے۔ مرد نے جونہی ٹکوا اٹھایا سپاہی بندوق ہاتھ میں لیے تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ مرد کے ہاتھ سے ٹکوا گر پڑا۔ سپاہی نے اس کی ٹانگ پر گولی چلا دی۔ عورت کے ہاتھ پاؤں باندھ کر چارپائی پر دھکیلا اور ٹکوا اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ پھر دروازہ بند کر کے باہر سے زنجیر چڑھا دی اور دوسری کوٹھڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ صبح پھٹتے ہی وہ نکل کر آگے چل پڑا۔ راستے میں وہ اپنی حماقت پر افسوس کرتا جا رہا تھا کہ بزرگ کی ہدایت کے باوجود اس نے لمبے گھونگٹ والی پر اعتبار کر لیا۔

اچھی خاصی رات اتر آئی تھی‘ جب وہ اپنے گاؤں میں داخل ہوا۔ اس نے دروازے پر دستک نہ دی بلکہ مکان کے پچھواڑے پڑے ہوئے کاٹھ کباڑ کی مدد سے دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا۔

کمرے میں مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک خالی تھی دوسری پر اس کی بیوی سوئی ہوئی تھی۔ اسی چارپائی پر کوئی مرد بھی موجود تھا۔

سپاہی کا دماغ ایک دم گھوم گیا۔ اس کا ہاتھ بندوق کی طرف بڑھا مگر ساتھ ہی اس کے کانوں میں بزرگ کا وہ فقرا گونج اٹھا ”ہر کام سے پہلے تین بار سوچو!!“

اس نے ابھی دل میں یہ الفاظ دوہرائے تھے کہ نیند میں ڈوبی ہوئی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

”بیٹا‘ ذرا پرے ہٹ کر لیٹ۔ اتنا بڑا ہو گیا ہے ابھی تک الگ سوتے میں ڈرتا ہے“۔

اس کی بیوی بڑبڑا رہی تھی۔

”ارے....؟ یہ تو میرا بیٹا دلاور ہے!“

سپاہی کا دل جواں سال بیٹے کو دیکھ کر کھل اٹھا۔ جسے وہ ڈھائی تین سال کا ننھا سا بچہ چھوڑ کر گیا تھا۔

”میری حلال کی کمائی اکارت نہیں گئی۔ بزرگ نے مجھے زندگی کے تین قیمتی گر بتائے“ وہ سوچ رہا تھا۔

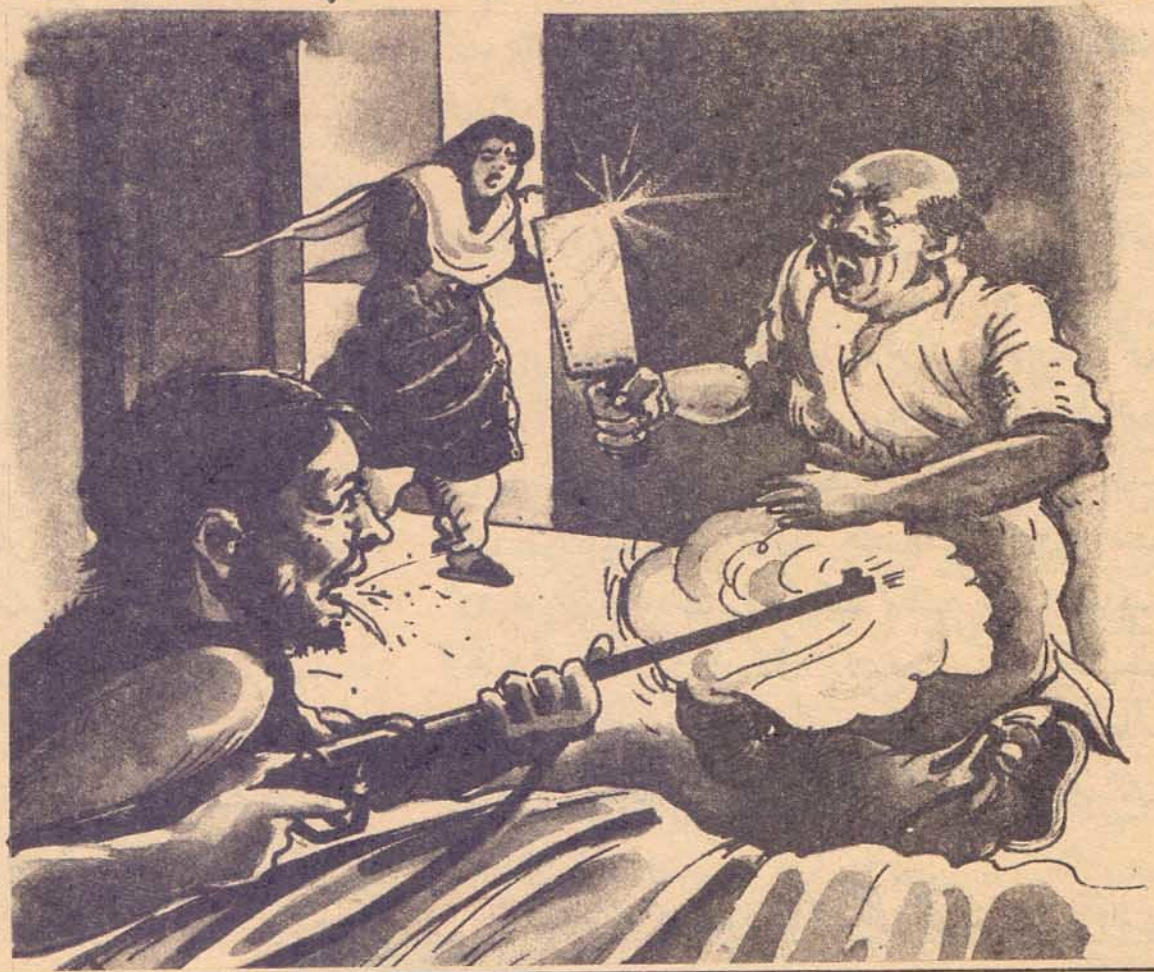

چاچو چاند بنے جاسوس

محمد معروف چشتی

"چاچو آج تو مجھے بائی سکل پر اسکول چھوڑ آئیں" میں نے چاچو چاند کی منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھئی آج کیوں بائی سکل پر چھوڑ آؤں۔ آج تو میرے پاس بالکل وقت نہیں" چاچو نے بدستور ناول پڑھتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں چاچو آپ خود ہی تو کہتے تھے کہ مجھے واور قاسم کو اکٹھا آپ بائی سکل پر سوار نہیں کرواسکتے۔ آج تو میں اکیلا ہوں اور آج گرمی بھی بہت ہے۔ اسکول سے لانا بھی آپ کو ہو گا" میں نے زبردستی کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی آج تو بالکل وقت نہیں، کل ہی نیا ناول لایا ہوں۔ جب تک یہ ختم نہیں ہو جاتا میں نہیں اٹھ سکتا" چاچو نے صاف جواب دے دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں ابو سے کہ کر آپ کی بائی سکل لے جاتا ہوں"۔

"خبردار ایسی حرکت نہیں کرنی۔ بائی سکل تو میں کسی قیمت پر نہیں دے سکتا۔ ہاں البتہ تمہیں اسکول چھوڑ آؤں گا"۔

"صرف چھوڑنا نہیں دوپہر کو لانا بھی ہے۔ دیکھیں تو سہی آج کتنی گرمی ہے۔ کیا آپ یہ برداشت کریں گے کہ آپ کا معصوم بھتیجا دھوپ میں سر جلائے۔ جب کہ آپ کے پاس اتنی خوب صورت بائی سکل بھی ہو" میں نے حسب معمول چاچو کا دل موم کیا۔

"ہاں یہ تو ہے، میں اسکول سے لے بھی آؤں گا"۔ چاچو فوراً باتوں میں آگئے۔ دراصل پچھلے ہی ہفتے چاچو نے نئی بائی سکل لی تھی اور وہ اس کی طرف کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔ جب کہ ہم دونوں بھائی اسی کے درپے رہتے کہ بائی سکل کو استعمال میں لایا جائے۔ مگر چاچو ہمیشہ یہ کہتے "میں تم دونوں کو بیک وقت بائی سکل پر بٹھا کر اس پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا" اور ہم دیکھتے رہ جاتے۔ اس دن قاسم کو بخار ہو گیا اور میرا کام بن گیا۔ مگر چاچو چاند جاسوسی ناولوں کے شوق میں اٹھ ہی نہیں رہے تھے۔ پتا نہیں انہیں کہاں سے یہ شوق لگ گیا ہے۔ ان کا پتا بھی نہیں چلتا اچانک ہی کوئی نہ کوئی شوق پال لیتے ہیں۔

اسکول جاتے ہوئے ہم ایک گلی میں مڑے تو آگے ہمارے ایک استاد صاحب ہاتھ میں بیگ لیے جا رہے تھے۔ دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا، چاچو چاند نے دیکھا تو کہنے لگے۔

"عاصم، دیکھنا مجھے یہ آدمی کچھ مشکوک نظر آتا ہے۔ اس کا تعاقب نہ کیا جائے؟"

"خدا کے لیے چاچو جان ایسی حرکت نہ کیجئے گا۔ یہ ہمارے استاد صاحب ہیں اور ان کے اس بیگ میں ہمیشہ بانس کا ڈنڈا موجود رہتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو میرے ساتھ آپ بھی ڈنڈے کھا بیٹھیں" یہ سننا تھا کہ چاچو نے ڈر کے مارے گلی بدل لی۔

اب واپسی کی سنیے۔ چھٹی کے وقت چاچو مجھے عین وقت پر لینے آگئے۔ میں بائی سکل پر چڑھ بیٹھا۔ چاچو چاند کو چوں کہ جاسوسی کا شوق لگا ہوا تھا، اس لیے بائی سکل پر بیٹھتے ہی جاسوسی پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ کبھی اچھے جاسوس کی خصوصیات گنوانا شروع ہو جاتے تو کبھی قوت مشاہدہ کو تیز کرنے پر زور دینے لگتے۔ اتنے میں میری نظر کولڈ ڈرنکس کی دکان پر پڑی۔ میں نے فوراً چاچو کو مکھن لگایا۔

"چاچو، آپ نے تو بہت جلد جاسوسی کے گر سیکھ لیے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر کہیں چوری ہو جائے تو آپ با آسانی پکڑ لیں گے چوروں کو۔ اتنی جلدی تو کوئی ذہین انسان ہی جاسوسی سیکھ سکتا ہے" چاچو خوشی سے پھول گئے اور کہنے لگے۔

"بھتیجے، بات تم نے بھی صحیح کی ہے۔ جاسوسی بچوں کا کھیل تھوڑی ہے۔ یہ تو ہمارے جیسا ذہین انسان ہی کر سکتا ہے"۔ چاچو چاند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں فوراً اصل مقصد کی طرف آیا۔

"چاچو جان، کیا خیال ہے ایک ایک جوس نہ لے لیا جائے۔ دماغ ٹھنڈا ہو تو قوت مشاہدہ بڑھ جاتی ہے"۔

"کیوں نہیں بھئی جاسوسی کے لیے ٹھنڈا دماغ بہت ضروری ہے" اور اس کے ساتھ ہی چاچو دو جوس پکڑ لائے۔

ہم مزے سے جوس پیتے جا رہے تھے کہ اچانک پیچھے سے ایک تیز رفتار کار ہمارے پاس سے گزری۔ ہم اس پر دھیان نہ دیتے مگر کسی بچے کی چیخ پکار نے ہمیں متوجہ کر لیا جو کار سے ہی آ رہی تھی۔ چاچو چاند فوراً بولے۔

"عاصم دیکھنا مجھے لگتا ہے کسی بچے کو اغوا کیا گیا ہے۔ تبھی تو وہ اتنے زور سے رو رہا تھا۔ ورنہ عام بچے تو اس قدر زور سے نہیں روتے۔ میرے خیال میں اس کا پیچھا کرنا چاہیے"۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، چاچو نے بائی سکل دوڑانا شروع کر دی۔ کہاں کار اور کہاں بائی سکل! مگر چاچو کو کون سمجھائے۔ میں پچھلی سیٹ پر قابو ہو کر بیٹھ گیا اور چاچو نے کھڑے ہو کر بائی سکل دوڑانا شروع کر دی۔ بڑی سڑک پر پہنچے تو وہ نیلے رنگ کی کار ہمیں ایک ہوٹل کے آگے کھڑی نظر آئی۔ چاچو نے فوراً پہچان لی۔ بائی سکل ایک طرف کھڑی کر کے تالا لگایا۔ چاچو نے مجھے بچہ سمجھ کر بائی سکل کے پاس ہی کھڑا کیا اور خود کار کے ارد گرد ٹہلنے لگے۔

جب کچھ پتا نہ چلا تو شیشے کے ساتھ آنکھیں لگا کر اندر جھانکنے لگے۔ اتنے میں ایک پولیس والا ادھر آ نکلا۔ اس نے چاچو کو کار کے اندر جھانکتے دیکھا تو چپکے سے آ کر چاچو کو گدی سے پکڑ لیا۔

"پکڑا گیا ناں بچو! پچھلے ایک ہفتے سے تیری تلاش میں تھا۔ اب بتا کدھر جائے گا؟"

"جناب، اس کار کی تلاشی لیجئے۔ اس کے اندر بچہ ہے"۔ چاچو نے کہا۔

"ارے بچے کے کچھ لگتے، اب کے تیری چال کام یاب نہیں ہو گی"۔ سپاہی نے ابھی تک چاچو کو گدی سے پکڑ رکھا تھا۔

"کیا بات ہے دل دار حسین؟ اسے کیوں پکڑ رکھا ہے؟" ایک تھانے دار صاحب نے ہوٹل سے نکلتے ہوئے پوچھا۔ ان کے ساتھ دو اور سپاہی بھی تھے۔

ملازم حسین نے فوراً سلیوٹ مارا اور کہا "جناب' یہ کار چوری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے جان کی بازی لگا کر پکڑا ہے"۔

"جناب' یہ غلط سمجھے ہیں۔ میں تو ایک بچے کے اغوا کے سلسلے میں اس کار کے پیچھے آیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایک بچہ اغوا کر کے اس میں لایا گیا ہے۔ آپ اس کار کی تلاشی لیں"۔ چاچو نے تفصیل بتائی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ اپنا جرم چھپانے کے لیے دوسروں پر الزام لگاتے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ میری یعنی ایس ایچ او قربان علی کی گاڑی ہے؟" تھانے دار صاحب نے کہا۔

میں نے معاملہ سنگین ہوتے دیکھا تو فوراً ان کے پاس پہنچا۔ "جناب' یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ابھی ابھی اس کار کے ذریعے ایک بچہ اغوا کیا گیا ہے" میں نے چاچو کے حق میں گواہی دی۔

"ارے تم کون ہو اور کہاں سے ٹپک پڑے ہو؟" ایس ایچ او صاحب نے بارعب آواز میں پوچھا۔

"میں ان کا بھتیجا ہوں یعنی یہ میرے چاچو ہیں"۔

دل دار حسین نے چاچو کو چھوڑ کر مجھے پکڑ لیا اور بولا۔ "سر' اس کا مطلب ہے پورا گینگ ہی گرفتار ہو گیا ہے۔ اسے بھی تھانے لے چلتے ہیں"۔

ایس ایچ او صاحب نے دونوں سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے ہمیں گاڑی کے اندر دھکیل دیا۔ مجھے فوراً بائی سکل کا خیال آیا۔ میں نے کہا۔ "تھانے دار صاحب' میری بائی سکل بھی ادھر کھڑی ہے' وہ تو لے آنے دیں"۔

"اس کی تم فکر نہ کرو میرے ببلو کے کام آجائے گی۔ بے چارا روزانہ پیدل کالج جاتا ہے"۔ دل دار حسین نے کہا اور ایس ایچ او صاحب نے گاڑی دوڑا دی۔

ہم عجیب مشکل میں پھنس گئے تھے۔ تھانے پہنچتے ہی میں نے گھر فون کیا۔ جلد ہی والد صاحب تھانے پہنچ گئے۔ ایس ایچ او صاحب ان کے جاننے والے تھے۔ ابو کی موجودگی میں جب ایس ایچ او صاحب نے ہمیں بولنے کا موقع دیا تو میں نے سارا واقعہ کہ سنایا۔ جسے سنتے ہی ایس ایچ او صاحب قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔ پھر بولے۔

"بچو جسے تم اغوا شدہ بچہ سمجھے تھے وہ تو میری کار کا ہارن ہے جس کی آواز بچے کے رونے جیسی ہے"۔

یہ سننا تھا کہ میں چاچو چاند کی قوت مشاہدہ کو کوسنے لگا۔

دلچسپ اور ناقابلِ یقین

عبدالستار خان طاہر

سونے کا تابوت

یہ قبل از مسیح کا واقعہ ہے کہ فارس (موجودہ ایران) کا بادشاہ جس نے مشرق وسطیٰ کے بہت سے علاقے فتح کیے تھے۔ فوت ہو گیا۔ اس کا نام "قبر ص اعظم" تھا۔ اسے سونے کے تابوت میں بند کر کے دفن کیا گیا اور سنگ مرمر کا 35 فٹ اونچا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ 200 سال بعد 330 قبل مسیح میں اسکندر اعظم کا توتی بولنے لگا۔ اس نے فارس کا تھوڑا سا جنوبی حصہ فتح کر لیا۔ اسکندر اعظم کے کچھ فوجی افسروں نے سنا تھا کہ ایک بادشاہ کو کبھی سونے کے تابوت میں دفن کیا گیا تھا۔ اب یہ مقبرہ اسکندر اعظم کے قبضے میں تھا اور اس پر پہرہ کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ان افسروں میں سے ایک افسر نے سونے کا یہ تابوت نکال لیا اور قبر ص اعظم کی لاش کی ہڈیاں کہیں اور دفن کر دیں۔ اس واقعہ کے 6 سال بعد اسکندر اعظم اس علاقے میں آیا اور اس مقبرے میں گیا۔ اسے شک ہوا کہ یہاں کھدائی کی گئی ہے۔ اس نے تفتیش کروائی تو راز فاش ہو گیا۔ اسکندر اعظم نے ان فوجی افسروں کو جو 6 سال پہلے مقبرے پر پہرہ دیتے تھے بڑی سخت اذیتیں دے دے کر مار ڈالا اور اپنے اس افسر کو جس نے تابوت نکالا تھا، قتل کروا دیا۔ تابوت اور ہڈیوں کے ڈھانچے کی نشان دہی ہو گئی تھی۔ اسکندر اعظم نے دونوں چیزیں برآمد کروا کے ہڈیاں تابوت میں رکھیں اور تابوت کو مقبرے میں دفن کر دیا۔ پھر بہت مدت بعد کسی نے تابوت نکال لیا۔ آج بھی جنوبی ایران میں یہ مقبرہ ایک شہر کے کھنڈروں میں کھڑا ہے لیکن اس کے اندر تابوت اور قبر ص اعظم کی ہڈیاں نہیں۔

مچھلی کا تابوت

1994ء میں براعظم افریقہ کے ایک ملک گھانا (GHANA) کے دارالحکومت "اکرا" میں ایک بڑا آدمی مر گیا۔ اس بڑے آدمی کے آخری دیدار کے لیے جو تابوت دکھایا گیا وہ تابوت نہیں بلکہ بہت بڑی مچھلی تھی۔ اس کی لمبائی 10 فٹ سے کچھ زیادہ اور اونچائی 5 فٹ کے لگ بھگ تھی۔ یہ لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ مچھلی کے ایک پہلو سے ڈھکنا اوپر اٹھایا گیا۔ مرنے والے کی لاش مچھلی کے اندر پڑی تھی۔ مرنے والے کا نام "دیدے نونو" تھا اور وہ ماہی گیری کی صنعت کے چند ایک بڑے سربراہوں میں سے تھا۔ دیدے نونو نے وصیت کی تھی کہ اس کی لاش لکڑی کی مچھلی میں بند کر کے دفن کی جائے۔

بیل کا تابوت

گھانا کے ایک جاگیر دار نے رواج کے مطابق لکڑی کا اعلیٰ نسل کا بیل بنوایا۔ اس کا ڈھکنا پیٹھ پر بنایا گیا تھا۔ اس جاگیر دار

کا فارم تھا جس میں گائیں اور بیل تھے۔ وہ مر گیا تو اسے لکڑی کے بیل کے اندر رکھا گیا اور دفن کر دیا گیا۔ کیوں کہ اس جاگیر دار کی یہی خواہش تھی۔

جیٹ کا تابوت

گھانا ہی کے شہر "توگو" کا ایک آدمی ہالینڈ کی ایئر لائن کے ایل ایم کا پائلٹ تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں لکڑی کا چار انجنوں والا ایک جیٹ طیارہ بنوالیا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ مرا تو اس کی لاش لکڑی کے اس طیارے میں رکھ کر دفن کی گئی۔ یہ شخص جو ایک یورپی ایئر لائنز کا جیٹ پائلٹ تھا اس نے جو طیارہ بنوایا تھا' وہ برائے نام طیارہ نہیں تھا بلکہ اس کے پہیے اور انجن صحیح شکل کے بنائے گئے تھے اور بالکل صحیح جگہ پر لگائے گئے تھے۔

کھوپڑی کی واپسی

پہلی جنگ عظیم (1914ء سے 1918ء) کے خاتمے کے بعد جون 1919ء میں شکست خوردہ جرمنی اور فاتح اتحادیوں (برطانیہ اور دیگر ممالک) کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کو "معاہدہ ورسیلز" کا نام دیا گیا۔ اس معاہدے میں فاتح اتحادیوں نے جرمنی سے جو شرطیں منوائیں' ان میں ایک شرط ایسی شامل کی گئی جو کبھی کسی بین الاقوامی معاہدے میں شامل نہیں کی گئی۔ شرط یہ تھی کہ 6 ماہ کے اندر جرمنی برطانیہ کو "ٹانگا نیکا" (مشرقی افریقہ) کے سلطان "مکواوا" کی کھوپڑی واپس کرے گا۔

اس کھوپڑی کا قصہ یہ تھا کہ جب ٹانگا نیکا پر جرمنی کا قبضہ تھا تو ایک مسلمان افریقی سلطان "مکواوا" نے جرمنی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ایک تحریک شروع کی تھی۔ جرمنوں نے اس جرم میں سلطان مرحوم کو گرفتار کر لیا اور اس کا سر کاٹ کر جرمنی بھیج دیا۔ "مکواوا" کا قبیلہ جرمنوں سے مطالبہ کرتا رہا کہ ان کے سلطان کا سر انہیں واپس کیا جائے۔ قبیلے کے سرداروں نے برطانیہ اور فرانس جیسے مہذب ملکوں کو قائل کر لیا کہ وہ جرمنی سے ان کے سردار کا سر واپس لینے کی شرط معاہدے میں شامل کر لیں۔ یہ شرط بڑی عجیب لگتی تھی لیکن معاہدے میں شامل کر لی گئی۔ اس طرح جرمنی کو سلطان "مکواوا" کی کھوپڑی اس کے قبیلے کو واپس کرنا پڑی۔ یہ معاہدہ ورسیلز کے آٹھویں پارٹ سیکشن دو کا آرٹیکل 246 تھا۔

بغیر کھوپڑی کے لاش

1923ء میں میکسیکو کا ایک بڑا دہشت ناک اور خطرناک انقلابی لیڈر "فرانسسکو ولا" قتل ہو گیا۔ لیکن وہ اتنا چالاک اور چھلاوے کی طرح غائب ہونے والا تھا کہ امریکا کی حکومت کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ واقعی مارا گیا ہے۔ کیوں کہ وہ کہیں نظر بھی نہیں آتا تھا اور اس کے بارے میں یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اگر وہ قتل ہو گیا ہے تو اسے اس کے ساتھیوں نے کہاں دفن کیا ہے۔ آخر کار امریکی حکومت نے اعلان کیا کہ جو شخص "فرانسسکو ولا" کا سر لائے گا اسے 50 ہزار امریکی ڈالر انعام دیا جائے گا۔ تین سال بعد میکسیکو کے ایک کیپٹن نے اس کی قبر ڈھونڈ نکالی اور رات کے وقت اکیلے اس کی قبر کھود کر اس کی کھوپڑی نکال لی۔ کھوپڑی کا گوشت سوکھ کر ختم ہو چکا تھا۔ جس سے یہ شناخت ممکن نہیں تھی کہ یہ فرانسسکو ولا کی کھوپڑی ہے' اس لیے کیپٹن کو امریکی حکومت سے انعام نہ ملا۔ اس نے مایوس ہو کر کھوپڑی کہیں پھینک دی۔ 1976ء میں میکسیکو کی حکومت نے "فرانسسکو ولا" کی ہڈیوں کا ڈھانچہ اس کی گم نام قبر سے نکال کر انقلاب کی یادگار کے نیچے تہ خانہ میں رکھ دیا۔ مگر اس ڈھانچے کے ساتھ کھوپڑی نہیں۔

محمد عمر سلیم

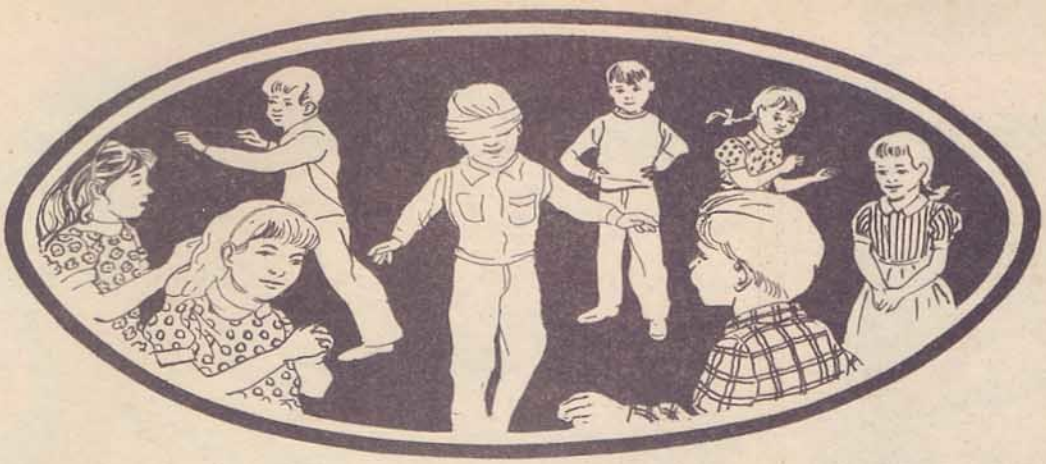

دلچسپ کھیل

جوڑا جوڑا

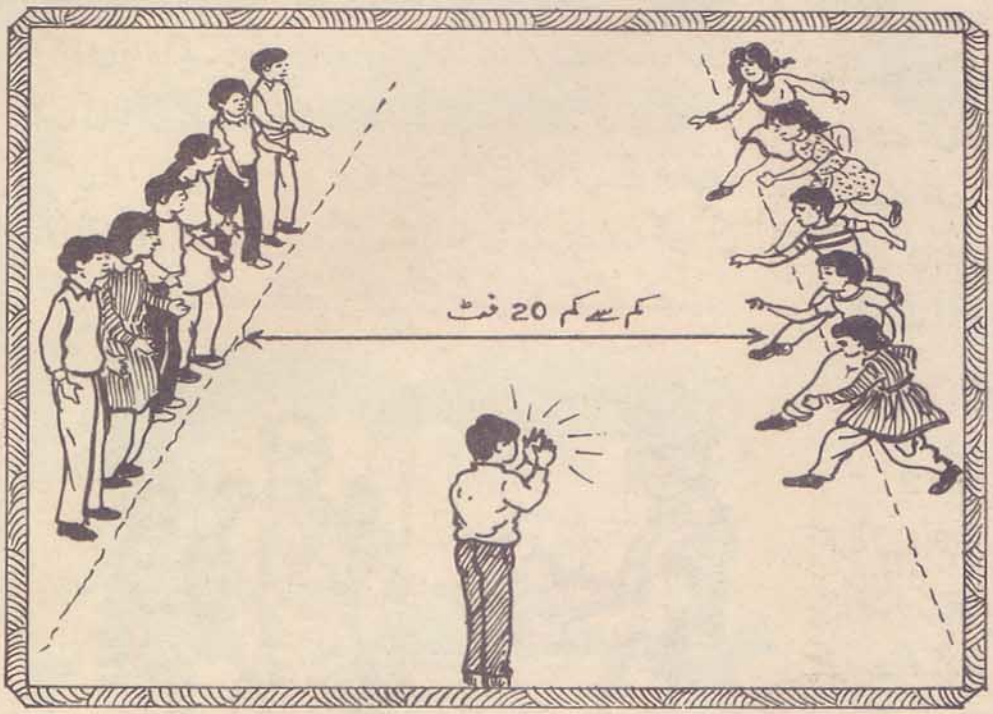

اس کھیل کو جتنے بچے چاہیں کھیل سکتے ہیں۔ یہ کھیل کھیلنے کے لیے بچوں کو دو ٹیموں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ اب کسی بھی ٹیم کا ایک بچہ جج بن جاتا ہے۔ یعنی دو ٹیموں میں سے ایک ٹیم میں ایک بچہ کم ہو جاتا ہے۔ اس کھیل میں ضرورت بھی یہی ہوتی ہے کہ دونوں میں سے ایک ٹیم میں ایک بچہ کم ہو۔

کھیل شروع کرنے سے پہلے کم از کم 20 فٹ کے فاصلے پر دو لمبی لائنیں لگا لیں اور ان دونوں لائنوں پر دونوں ٹیمیں کھڑی ہو جائیں۔ ٹاس کے ذریعے پہلے باریاں مقرر کر لیں۔ پہلی باری جس ٹیم کی ہو گی اگر اس میں 6 بچے ہوں تو دوسری ٹیم میں پانچ ہوں گے۔ اب جو بچہ جج بنے ہے وہ تالیاں بجانی شروع کرے۔ تالی رکتے ہی ٹاس کے ذریعے پہلی باری پر آنے والی ٹیم کے سارے بچے دوسری لائن پر کھڑے ہوئے بچوں کی طرف دوڑیں گے اور بھاگ کر سامنے کی لائن پر کھڑے بچوں میں سے اپنا اپنا ساتھی پکڑ لیں گے۔

یاد رہے کہ بھاگنے والی ٹیم میں دوسری ٹیم سے ایک بچہ زیادہ ہے۔ جس بچے کو بھاگ کر دوسری لائن پر کھڑے ہوئے بچوں میں سے اپنا ساتھی نہیں ملے گا وہ بچہ باہر نکل جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری لائن کا جو بچہ سب سے آخر میں پہلی لائن کے کسی بچے کا ساتھی بنا ہو گا، وہ بھی نکل جائے گا۔ یعنی دوسری لائن پر کھڑے ہوئے بچوں کی بھی کوشش ہونی چاہیے کہ وہ سامنے سے آنے والے بچوں کو جلدی سے پکڑ کر اپنا ساتھی منتخب کر لیں۔

یہی راؤنڈ ایک دفعہ پھر ہو گا۔ اس دفعہ دونوں ٹیموں کا ایک ایک بچہ کم ہو چکا ہو گا یعنی بھاگنے والی ٹیم کا وہ بچہ جسے ساتھی نہیں ملا اور کھڑی ہوئی ٹیم کا وہ بچہ جسے سب سے آخر میں ساتھی بنایا گیا۔

اسی طرح یہ راؤنڈ بار بار ہوں گے۔ ہر راؤنڈ پر دونوں ٹیموں سے ایک ایک بچہ نکالا جاتا رہے گا۔ آخر میں بھاگ کر آنے والی ٹیم کے دو اور سامنے والی ٹیم کا ایک بچہ بچ جائیں گے۔ ان دونوں بچوں میں سے جو جج کی تالی ختم ہوتے ہی بھاگ کر سامنے کھڑے ہوئے بچے کو پہلے پکڑ لے گا، وہی جوڑا جیت جائے گا۔

تالی دائرہ

سب سے پہلے بچے دو برابر ٹیموں میں تقسیم ہو جائیں اور زمین پر ایک اتنا بڑا گول دائرہ بنالیں جس کی لائنوں پر دور دور پانچ سات بچے کھڑے ہو سکیں۔ اب ٹاس کر کے پہلے باریاں مقرر کر لیں۔ جس ٹیم کی دوسری باری آئے اس کے بچے دائرے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو جائیں اور پہلی باری آنے والے بچے دائرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بکھر کر کھڑے ہو جائیں۔

کھیل شروع کرنے کے لیے دائرے پر کھڑے سارے بچے تالیاں بجانی شروع کریں۔ دوسری ٹیم کا کپتان اسٹاپ کہے تو وہ تالیاں بجانی بند کر کے بھاگ کر ارد گرد کھڑے دوسری ٹیم کے بچوں کو پکڑنے کی کوشش کریں۔ اب پہلی ٹیم جو کہ دائرے سے باہر کھڑی تھی اس کے ہر بچے کا الگ الگ کام ہو گا کہ وہ دائرے پر جا کر کھڑا ہو جائے۔ جب کہ ارد گرد کھڑے ہونے والی دوسری ٹیم کو دائرے پر کھڑی ٹیم کے بچے پکڑنے کی کوشش کریں گے۔ جو بچہ پکڑا جائے گا وہ آؤٹ ہو جائے گا اور جو بچہ بھاگ کر دائرے کی لائن پر کھڑا ہو جائے گا وہ بچ جائے

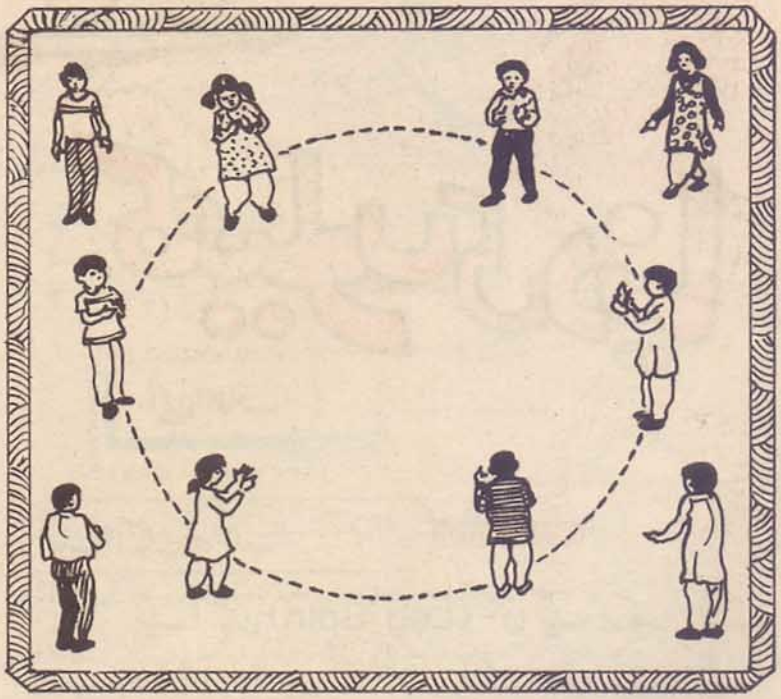

گا۔ جتنے بچے بچ کر دائرے پر آ کر کھڑے ہو جائیں گے اب وہ تالیاں بجائیں گے اور پہلے جو ٹیم دائرے پر کھڑی تھی وہ ارد گرد کھڑی ہو گی۔ یہ راؤنڈ بار بار دھرائے جائیں گے۔ پکڑے جانے والے ساتھی دونوں ٹیموں سے کم ہوتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ کسی ایک ٹیم کے مکمل ساتھی پکڑے جائیں گے اور وہ ہار جائے گی۔

ہر اچور پکڑ ایئے

اس کھیل کو شروع کرنے سے پہلے پگ کر کسی ایک بچے کو چور بنا دیا جاتا ہے اور اسے دوسری طرف منہ کر کے کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس عرصے میں باقی بچے اپنی اپنی مٹھیاں بند کر لیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بچہ اپنی مٹھی میں کسی بھی درخت یا پودے کا پتہ چھپا لیتا ہے۔ اب چور سے کہا جاتا ہے کہ میرے چور کو پکڑ لو۔ وہ بھاگ بھاگ کر سارے بچوں کو باری باری پکڑتا ہے۔ ہر بچے کو پکڑنے کے بعد چور اس کی مٹھی کھولتا ہے۔ اگر پکڑے جانے والے بچے کی مٹھی میں ہرا پتہ نکل آئے تو وہ زور سے چلائے گا "ہر اچور پکڑا گیا"۔ لیکن اگر مٹھی خالی نکلے تو پکڑا جانے والا بچہ آؤٹ ہو جاتا ہے۔ یعنی یا تو ہر اچور پکڑا جاتا ہے یا بچے آؤٹ ہو ہو کر کم ہوتے جاتے ہیں اور بعد میں صرف ہرا

چور ہی بچتا ہے۔ دونوں صورتوں میں چاہے وہ پکڑا جائے یا آخر میں بچے' اگلے کھیل میں چور وہی بنتا ہے۔ یہ کھیل بار بار کھیلا جا سکتا ہے۔

کھیلوں کی دنیا

قسط 7

کرکٹ کیا اور کیسے؟

این الطاف

لیگ اسپن بولنگ

لیگ اسپن (Leg Spin) یعنی لیگ بریک بولنگ سب سے دشوار اور جارحانہ قسم کی بولنگ ہوتی ہے۔ ہر لیگ اسپنر کا لیگ بریک گیند کرانے کا اپنا خاص ڈھنگ ہوتا ہے۔ البتہ ان میں یہ قدر مشترک ہوتی ہے کہ زیادہ تر لیگ بریک اسپنرز زاویہ بناتے ہوئے گیند کراتے ہیں۔ اگرچہ اس میں زیادہ کردار کلائی کا ہوتا ہے تاہم لیگ اسپنرز کی بنیادی گرفت آف اسپنرز سے مختلف نہیں ہوتی۔ پہلی دو انگلیاں سیم سے ترچھی ہو کر گیند کو پکڑتی ہیں۔ تیسری انگلی سیم پر ہوتی ہے۔ یہی پوزیشن انگوٹھے کی ہوگی۔ ایکشن البتہ مختلف ہوتا ہے۔ لیگ بریک گیند ہاتھ کے پچھلے حصے سے پھینکی جاتی ہے جب کہ اسپن پیدا کرنا کلائی کا کام ہے۔ کیوں کہ ایک کندھا کلائی کی نقل و حرکت میں شریک ہوتا ہے دوسرا کندھا خود ہی جھک جاتا ہے۔ سر کو ساکت رکھنا لازمی ہے تاکہ آنکھیں ٹارگٹ پر رہیں اور یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ کلائی کا ایکشن بولنگ کی کنجی ہوتی ہے۔ اسی سے گیند زمین پر گر کر اپنا رخ بدلتی ہے۔

لیگ اسپنر کی جدتیں
(Leg Spinners Variations)

گگلی

لیگ اسپنرز کے پاس اس کی سب سے مشہور گیند گگلی (Googly) ہے۔ گگلی ایک ایسی آف اسپن گیند ہے جو لیگ بریک ایکشن سے کی جاتی ہے۔ لیگ بریک باؤلر کے پاس ایک

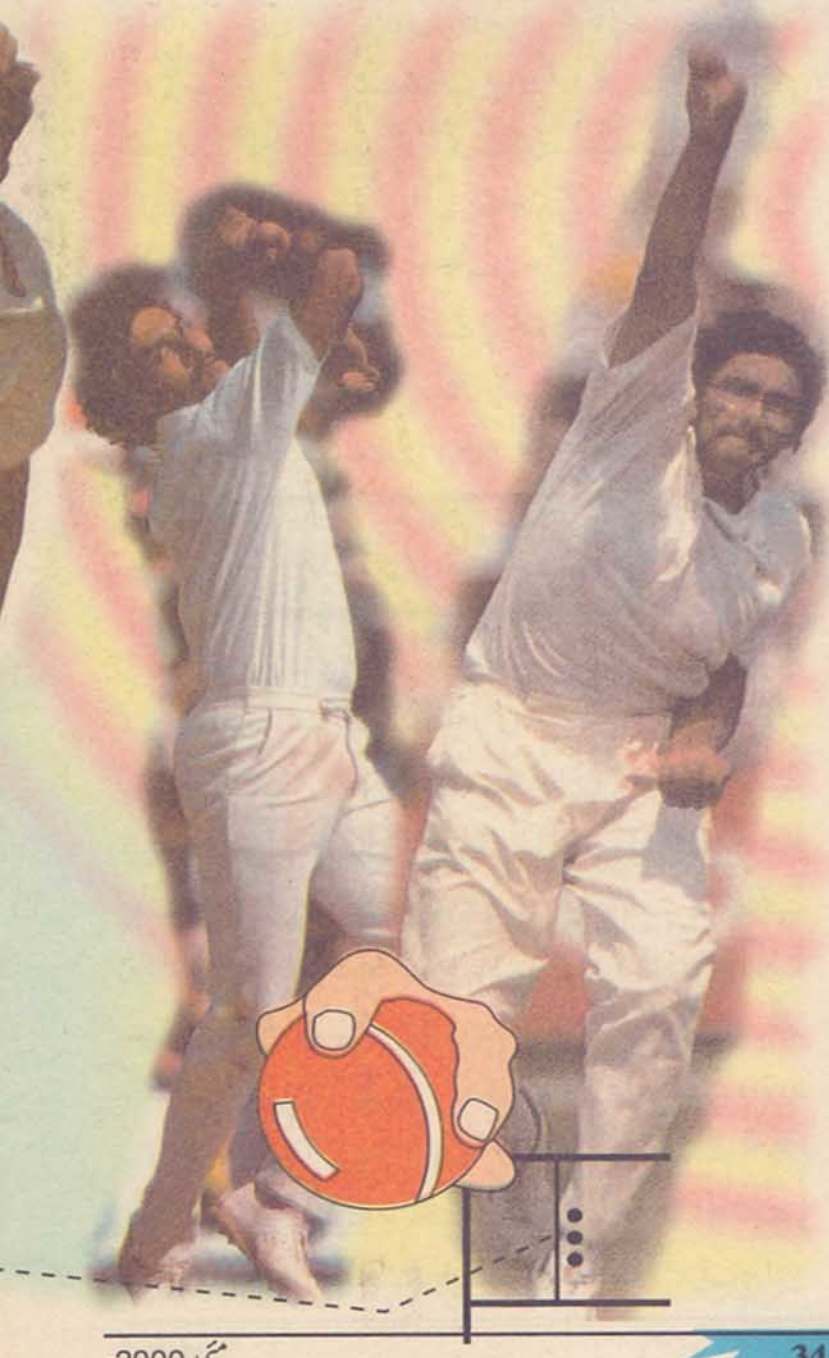

خطرناک حربہ ہوتا ہے۔ یہ گیند کسی بھی وقت بلے باز کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔ رفتار اور اسپن کو کبھی زیادہ اور کبھی کم کرنا لیگ بریک کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ گگلی ایک ایسی گیند ہے جسے ہاتھ کے پچھلے حصے سے پھینکا جاتا ہے اور یہ بلے باز سے دور ہونے کے بجائے اس کے اندر کی طرف آتی ہے۔ گگلی گیند کرنے کے لیے کلائی کو مکمل طور پر گھوم جانا چاہیے۔ اس میں ہاتھ کی ہتھیلی کا رخ اوپر آسمان کی طرف ہوتا ہے اور گیند ہاتھ کی تیسری اور چوتھی انگلی کے اوپر سے نکلتی ہے۔ یہ گیند ہوا میں یوں گھومتی ہے جیسے آف اسپن گیند۔ گگلی کے لیے اگلا پاؤں یعنی بایاں پاؤں فائن لیگ کے بجائے سیدھا بلے باز کی طرف ہونا چاہیے۔

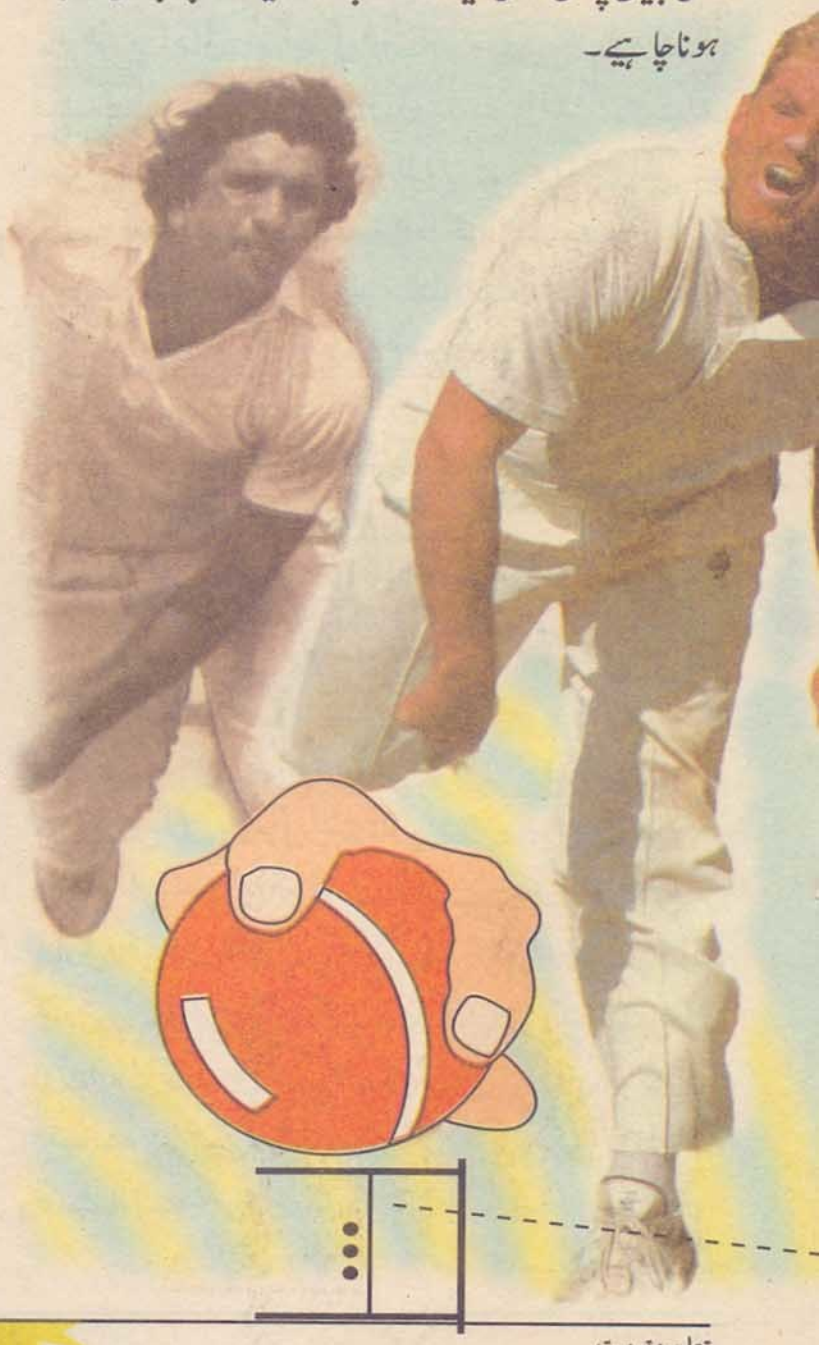

یہ بلاشبہ ایک مفید اور خطرناک گیند ہے۔ یہ عام طور پر اس وقت پھینکی جانی چاہیے جب بلے باز یہ سمجھ رہا ہو کہ آنے والی گیند بے ضرر ہے اور دور سے وش کرتی ہوئی چلی جائے گی لیکن اگر وہی گیند اچانک اندر آجائے تو یقیناً بلے باز ہکا بکا رہ جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے آف اسٹمپ یا اس سے ذرا باہر کی طرف پچ کیا جائے۔

ٹاپ اسپن

ٹاپ اسپن (Top Spin) ایک ایسی گیند ہے جو لیگ بریک ایکشن سے کی جاتی ہے۔ اس کے لیے کلائی کو اس طرح مڑنا چاہیے کہ گیند کرتے وقت اس کا رخ مڈ وکٹ کی طرف ہو۔ تاکہ انگلیاں گیند کو اس کی سلائی سے، جس کا رخ سیدھا اوپر سے وکٹ کی طرف ہو، باآسانی گھما کر پھینک سکیں۔ یہ گیند اس قدر پیچھے پھینکنا چاہیے کہ بلے باز اسے پچھلے پاؤں پر کھیلنے کی کوشش کرے مگر گیند کی تیز رفتاری کی وجہ سے وہ اسے کھیل نہ پائے۔ ایسی گیند اپنی سلائی کے بل گھومتی ہے۔ یہ سلائی پر گھومتی ہوئی زمین پر گرنے کے بعد کچھ تیزی سے اٹھ کر وکٹ کی طرف بڑھتی ہے، جہاں بلے باز کھڑا ہوتا ہے۔ اگر بلے باز اس کے کھیلنے میں ذرا سی بھی سستی کرے تو اس کی وکٹ کی خیر نہیں ہوتی۔ ٹاپ اسپن گیند کرتے ہوئے عام طور پر ہتھیلی کا رخ زمین کی طرف ہوتا ہے اور انگلیوں کا رخ بلے باز کے بجائے مڈ آن کی طرف۔

فلپر (Flipper)

گیند کی یہ قسم بھی لیگ بریک باؤلروں کے پاس بلے باز کو پریشان یا آؤٹ کرنے کے لیے ایک کام یاب حربہ ہے۔ یہ گیند جھکی ہوئی کلائی سے اس طرح پھینکی جاتی ہے کہ پھینکنے سے پہلے اسے پہلی انگلی اور انگوٹھے سے مضبوط گرفت میں پکڑا جاتا ہے۔ پھر یہ تیزی سے پہلی انگلی اور انگوٹھے کو چیرتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ یہ گیند ایک عام لیگ بریک کی طرح پھینکی جاتی ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک آف بریک ہی ہوتی ہے بس فرق اتنا

سا ہے کہ یہ ایک آف بریک کی طرح آہستہ آف اسٹمپ کے باہر سے گھوم کر اندر وکٹوں کی طرف نہیں آتی بلکہ تیزی کے ساتھ وکٹوں کی طرف آتی ہے۔

لیفٹ آرم سلو بولنگ

بنیادی طور پر اگر آف اسپن بولر کو الٹ دیا جائے تو وہ سلو لیفٹ آرم بولر بن جاتا ہے اور آف اسپنر کو دیئے جانے والے سارے فنی مشوروں کا اطلاق سلو لیفٹ آرم بولر پر ہو جاتا ہے۔ دونوں میں گرفت ایک سی ہوتی ہے۔ بولنگ ایکشن کی بیشتر چیزیں ایک سی ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کی سفارشات بھی ایک جیسی ہوتی ہیں کہ ایکشن کے دوران میں زیادہ سے زیادہ اچھلیں تاکہ باؤنس اور ٹرن میں مدد ملے۔ سلو لیفٹ آرم اور آف اسپن بولنگ میں ایک فرق ضرور ہوتا ہے اور وہ اٹیک کا زاویہ ہے۔ ایک آف اسپنر کو عام طور پر اوور دی وکٹ گیند پھینکتے ہوئے جہاں تک ممکن ہو اسٹمپ کے قریب تر ہونا چاہیے۔ دوسری طرف سیدھے ہاتھ سے بیٹنگ کرنے والے بلے باز کے خلاف بولنگ کرتے ہوئے بائیں ہاتھ سے آہستہ گیند پھینکتے ہوئے بولر کے لیے صحیح زاویہ یہ ہوگا کہ وہ راؤنڈ دی وکٹ بولنگ کرے۔ اس میں گیند گویا فضا میں ٹہلتی ہوئی بلے باز کی طرف آتی ہے اور ٹپہ پڑتے ہی یا تو سیدھی چلی جاتی ہے یا آگے نکل جاتی ہے۔ اس کا دارومدار اس بات پہ ہوتا ہے کہ پچ پر پڑنے سے گیند کو کتنا اسپن ملا ہے۔

آرم بال

آرم بال (Arm Ball) ایک سلو لیفٹ آرم بولر راؤنڈ دی وکٹ بولنگ کرتے ہوئے پھینکتا ہے جس سے اس کی یہ گیند خطرناک ہو جاتی ہے۔ بالکل آف اسپنر کی طرح پھینکی جانے والی اس گیند کو مہلک بنانے کے لیے کسی قسم کی فاضل سوئنگ کی ضرورت نہیں پڑتی کیوں کہ زور بازو سے یہ گیند ایسے زاویے سے پھینکی جاتی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یا تو وکٹ کو ہٹ کرے یا اگر بلے باز سے چھوٹ جائے تو ایل بی ڈبلیو (آؤٹ) ہو جائے۔

چائنا مین

بائیں ہاتھ سے آہستہ لیگ بریک گیند کو چائنا مین (China man) کہتے ہیں۔ یہ دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے بلے باز کے لیے ایک آف بریک گیند ہوتی ہے۔ ایسی گیند کو دائیں ہاتھ سے لیگ بریک کرنے کی طرح صحیح جگہ پر پھینکنے کے لیے کافی مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ اسپن زیادہ تر تیسری انگلی کی مدد سے کی جاتی ہے۔ اس لیے چائنا مین یعنی تیسری انگلی سے بائیں ہاتھ والے لیگ بریک بالر کی نسبت دائیں ہاتھ سے پہلی انگلی کے ذریعے آف بریک کرنے والا بولر عام طور پر آسانی سے گیند کی لینتھ اور سمت پہ کنٹرول رکھ سکتا ہے۔ کیوں کہ چائنا مین بولر کلائی کی مدد سے باؤلنگ کرتا ہے اس لیے اسے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی گیند دائیں ہاتھ سے آف بریک کرنے والے سے زیادہ اسپن ہوتی ہے۔ اگر بائیں ہاتھ سے گگلی اور چائنا مین گیند کرنے والے بولر کو گیند صحیح جگہ پر پھینکنے پر پورا کنٹرول ہو جائے تو وہ نہایت کامیاب بولر ثابت ہو سکتا ہے۔

اسپنر کی لینتھ اور لائن

ایک اسپنر کے لیے آئیڈیل لینتھ یہ ہے کہ میڈیم فاسٹ سے ذرا زیادہ اور فاسٹ بولر سے مزید زیادہ اور اوپر گیند پھینکے۔ یعنی اس طرح کہ بلے باز آگے بڑھ کر کھیلنا چاہے مگر وہاں تک نہ پہنچ سکے' جہاں گیند پچ ہوئی ہو۔ فنگر اسپنر کے مقابلے میں لیگ اسپنر کی لینتھ اگرچہ شارٹ ہوتی ہے تاہم فنگر اسپنر کو فل لینتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک آف اسپنر کی بنیادی لائن آف اسٹمپ پر یا اس سے ذرا باہر ہوتی ہے تاکہ اگر گیند ٹرن لے تو سیدھی وکٹ سے ٹکرائے۔ ایک اسپنر کو اپنی لائن اور لینتھ کی پریکٹس نہیں چھوڑنی چاہیے کیوں کہ یہ اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ اس میں ذرا سی غلطی بھی ہو جائے تو بلے باز اسے نظر انداز نہیں کرتا۔ (باقی آئندہ)

* * *

خالی جگہ پر کیجئے اور 450 روپے کی کتابیں لیجئے۔

ایک سے زائد اور سات سے کم حل موصول ہونے کی صورت میں انعام مساوی مالیت میں دیئے جائیں گے۔ سات یا سات سے زیادہ حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا اور چھ انعام بالترتیب 100, 90, 80, 70, 60 اور 50 روپے کی مالیت کی کتابوں کے دیئے جائیں گے۔

یہ جملے اسی شمارے میں چھپی ہوئی عبارت سے لیے گئے ہیں۔

1- یہی----اسلام کے پہلے شہید ہیں۔
2- میری حلال کی کمائی---- نہیں گئی۔
3- حضرت کوئی بات کیجئے کہ ---- کٹے۔
4- میں اس راستے پر چل رہا تھا جس پر ---- چلتے رہے تھے۔
5- خاص کر بغیر سامان---- کے تو یہ بالکل ناممکن ہے۔
6- اس میں پانی بھی تھا اور ---- بھی۔
7- ایسے کام کو جو بغیر کسی ظاہری سبب کے ہو جائے---- کہتے ہیں۔
8- مرنے والے کا نام---- تھا۔
9- اب اندھیرے میں ذو----اس کی پائنتی کی طرف موجود تھے۔
10- قدرتی طور پر بچے---- کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

جوابات علمی آزمائش اپریل 2000ء

(1) صفائی (2) بھوندو (3) ایروں غیروں (4) لاٹھی (5) دکھاوے (6) خود انسان (7) جرم (8) بھکاری کی مرغی (9) بیمار (10) سرطان یعنی کینسر۔

اس ماہ 823 ساتھیوں کے بالکل درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 6 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام دیئے جا رہے ہیں۔

☆ پہلا انعام: مدثر رضا' پھالیہ۔
☆ دوسرا انعام: محمد عثمان' راول پنڈی۔
☆ تیسرا انعام: محمد نعیم خان' لکی مروت۔
☆ چوتھا انعام: جمشید الحق' فیصل آباد۔
☆ پانچواں انعام: صائمہ کرن' اوکاڑہ۔
☆ چھٹا انعام: ماجد خالد' لاہور۔

ان ساتھیوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی شائع کئے جا رہے ہیں: اسما عزیز اوکاڑہ۔ سدرہ جمال فیصل آباد۔ ریحان اسلم راول پنڈی۔ حرا احمد لاہور۔ آمنہ منیر فیصل آباد۔ خرم شاہدرہ۔ حرا صدیق راول پنڈی۔ عدیلہ جبین راول پنڈی۔ محمد ندیم میلسی۔ محمد عثمان علی راول پنڈی۔ صدف شہزادی راول پنڈی۔ عظمیٰ سجاد لاہور۔ محمد قیوم لاہور۔ محمد مقصود ادریس دھنو آنہ چک 91 آر بی۔ عائشہ لئیق احمد لاہور۔ محمد ابرار رینالہ خورد۔ پرویز اختر پشاور۔ غلام مجتبیٰ شاہد پھالیہ۔ بینش ناز پشاور۔ علی اسد رضا کھوکھر ملتان۔ فیصل سعید لاہور۔ مدثر نذر راول پنڈی۔ راحت العین پشاور۔ رخسانہ امین فیصل آباد۔ عمارہ عروج اسماعیل خان۔ شیخ محمد اطہر لاہور۔ تنزیلہ عظمت راول پنڈی۔ محمد عثمان بھٹی راول پنڈی۔ امبر ارشاد لاہور۔ اقرا جمیل ظفروال۔ ماریہ ریاض لاہور۔ مرزا محمد ذی شان رؤف اوکاڑہ۔ ساجد علی تبسم بہاول پور۔ عادل نصیر بلوچ اسلام آباد۔ زنیرہ نوشین گیلانی فیصل آباد۔ وسیم حسین منگووال غزلی۔ ثمینہ لیاقت تھہ وڈانہ۔ حافظ غلام شعیب عباس فیصل آباد۔ زہرہ خانم قصور۔ عابد علی خان مدی خیل۔ عثمان لطیف لاہور۔ عائشہ بانو اسلام آباد۔ شرافت علی لاہور۔ عائشہ عارف راول پنڈی۔ سائرہ الطاف لاہور۔ واصف محمود فیصل آباد۔ عاصمہ کنول سمندری۔ مبشر احمد واہ چھاؤنی۔ خوش بخت ندیم راول پنڈی۔ عمر حیدر خان لاہور۔ علی احسن لاہور۔ سحرش سلیم لاہور۔ عاتکہ بنت خالد لاہور۔ سدرہ بنت نثار کراچی۔ محمد عظیم لاہور۔ انعم انوار لاہور۔ حنا عظیم اسلام آباد۔ مریم شہزادی لاہور۔ ارسلان سعید کراچی۔ راؤر ضوان شجاع آباد۔ صائمہ رشید سرگودھا۔ فائزہ چشتی کراچی۔ مزمل حمید اسلام آباد۔ سعدیہ بتول ملتان۔ امان اللہ خالد راول پنڈی۔ علی احسان لاہور۔ سدرہ رحیم اورکزئی پشاور۔ امیرہ حسن لاہور۔ حافظ عبداللہ فاروق لاہور۔ راؤ عبدالظہور لاہور۔ نبیلہ سردار فیصل آباد۔ صائمہ شفیق راول پنڈی۔ لیلیٰ مشتاق راول پنڈی۔ مجتبیٰ اعلیٰ اعوان گوجرانوالہ۔ طیبہ ارشاد ہزارہ۔ اشعر

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 7 مئی 2000ء

دماغ لڑاؤ

نام: _____

مقام: _____

پتا: _____

_____

ڈاکٹر رضوان ثاقب

مگرمچھ

پاکستان میں مگرمچھ صرف منگو پیر کے جوہڑ میں ملتے ہیں۔ سب سے زیادہ مگرمچھ افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ جھیل ہو یا دریا' ندی ہو یا نالہ' وہاں ہر کہیں مگرمچھ ملتے ہیں۔ مگرمچھوں کے حوالے سے افریقہ کی جھیل ٹانگانیکا بہت مشہور ہے۔ اس جھیل میں بے شمار مگرمچھ ہیں۔ یہ جنگلی جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔ افریقہ میں جہاں کہیں بہتا یا رکا ہوا پانی ملتا ہے وہاں مگرمچھ پائے جاتے ہیں۔ ان کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ زیادہ تر مگرمچھ سست رو پانی اور دل دل میں ملتے ہیں۔ مگرمچھ یا گھڑیال کو فارسی میں نہنگ انگریزی میں کرو کوڈائل (CROCODILE) جب کہ یونانی زبان میں کرو کوڈے لس کہا جاتا ہے۔ کرو کوڈے لس چھپکلی کو بھی کہتے ہیں۔ گویا مگرمچھ چھپکلی کی نسل سے ہے۔ چھپکلی صرف خشکی پر رہتی ہے جب کہ مگرمچھ پانی اور خشکی دونوں میں رہتا ہے۔ مگرمچھ پانی میں 15 منٹ سے زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ وہاں اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نتھنے پانی سے باہر رکھتا ہے تاکہ سانس لے سکے۔

جنوبی افریقہ میں ایک دریا لم پولو ہے جو ایک ہزار میل لمبا ہے۔ یہ جمہوریہ جنوبی افریقہ سے نکلتا ہے اور جنوبی موزمبیق سے بہتا ہوا بحر ہند میں گرتا ہے۔ اسے کرو کوڈائل ریور یعنی مگرمچھوں کا دریا کہا جاتا ہے۔ افریقہ میں ایک ایسا پرندہ بھی پایا جاتا ہے جسے کرو کوڈائل برڈ یعنی مگرمچھ پرندہ کہا جاتا ہے۔ یہ پرندہ مگرمچھ کی پشت پر اس وقت بیٹھتا ہے جب مگرمچھ پانی سے نکل کر دھوپ تاپ رہا ہو۔ مگرمچھ پرندہ ان کیڑوں مکوڑوں کو کھاتا ہے جو مگرمچھ کی پشت پر رینگتے ہیں۔

مگرمچھ چوری چھپے وار کرنے والا' ظالم اور ڈرپوک جانور ہے۔ مگر یہ دوسروں کو ڈراتا بھی ہے۔ یہ بڑا مکار اور ذہین جانور ہے۔ یہ ہٹ کا پکا ہوتا ہے اور انسانوں اور بے ضرر جانوروں کے لیے مصیبت بنا رہتا ہے۔ اسے چپ چاپ خشکی پر پڑا دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے مر گیا ہے لیکن شکار کو نگل کر اس طرح گرجتا ہے جیسے اس پر کسی نے بہت ظلم کیا ہو۔ یہ ہر وقت بھوکا دکھائی دیتا ہے اور اسے جو چیز نظر آتی ہے کھاتا جاتا ہے۔ اس کا منہ بند ہو تو یوں دکھائی دیتا ہے جیسے مسکرا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بھی ٹپک رہے ہوتے ہیں۔ کوئی بتا نہیں سکتا کہ یہ ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے۔ یہ زیادہ تر پانی میں رہتا ہے لیکن خشکی پر بھی رہ سکتا ہے۔

مگرمچھ واحد درندہ ہے جس سے تمام شکاری نفرت کرتے ہیں۔ یہ اپنے بچوں کو بھی کھا جاتا ہے اور اپنے مرے ہوئے ساتھی کو بھی نگل لیتا ہے۔ مگرمچھ کے دانت جنہیں دیکھ کر ڈر لگتا ہے' اس قابل نہیں ہوتے کہ انسان یا کسی جانور کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ سکیں۔ یہ دانت صرف پھندے کا کام دیتے ہیں۔ یہ شکار کو صرف پکڑتے ہیں۔ ان میں چبانے اور کاٹنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ مگرمچھ

امریکی مگرمچھ

کرو کوڈائل

کا صرف اوپر کا جبڑا حرکت کر سکتا ہے۔ اس کی زبان میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ شکار کو سموچا حلق سے نیچے اتار دیتی ہے۔ مگر یہ ہر ایک شکار کو فوراً نہیں نگلتا۔ چھوٹی مچھلیوں اور انسانوں کے چھوٹے بچوں کو تو فوری نگل لیتا ہے البتہ بڑے شکار کو کیچڑ میں دبا دیتا ہے جہاں شکار گلتا سڑتا رہتا ہے۔ جب گل سڑ کر نرم ہو جاتا ہے تو یہ اسے نکال کر نگل لیتا ہے۔ مگرمچھ شکار کو مار نہیں سکتا بلکہ اسے گھسیٹ کر گہرے پانی کی تہ میں لے جاتا ہے۔ جب شکار ڈوبنے سے مر جاتا ہے تو اسے

کہیں لے جا کر گلنے سڑنے کے لیے دبا دیتا ہے۔ یہ ہاتھی گینڈے اور جنگلی بھینسے تک کو شکار کر لیتا ہے۔ ہاتھی جب جھیل یا جوہڑ میں پانی پینے کے لیے اپنی سونڈ ڈالتا ہے تو مگرمچھ اس کی سونڈ پکڑ لیتا ہے۔ مگر مچھ کے جبڑوں میں آئی ہوئی چیز کو باہر نکالنا ناممکن ہوتا ہے۔ ہاتھی باہر کو زور لگاتا ہے لیکن درد کی وجہ سے وہ پانی میں چلا جاتا ہے۔ ہاتھی چوں کہ پانی میں زور نہیں لگا سکتا اس لیے مگرمچھ اسے گھسیٹتے ہوئے گہرے پانی میں لے جاتا ہے۔ جہاں ہاتھی پانی میں ڈوب کر مر جاتا ہے اور مگرمچھ اسے گلنے سڑنے کے لیے کہیں دبا دیتا ہے۔ جب ہاتھی کچھ دنوں کے بعد گل سڑ جاتا ہے، تو پھر یہ اسے مزے سے ہڑپ کر جاتا ہے۔

مادہ مگرمچھ اگست اور ستمبر کے مہینوں میں انڈے دیتی ہے۔

گھڑیال

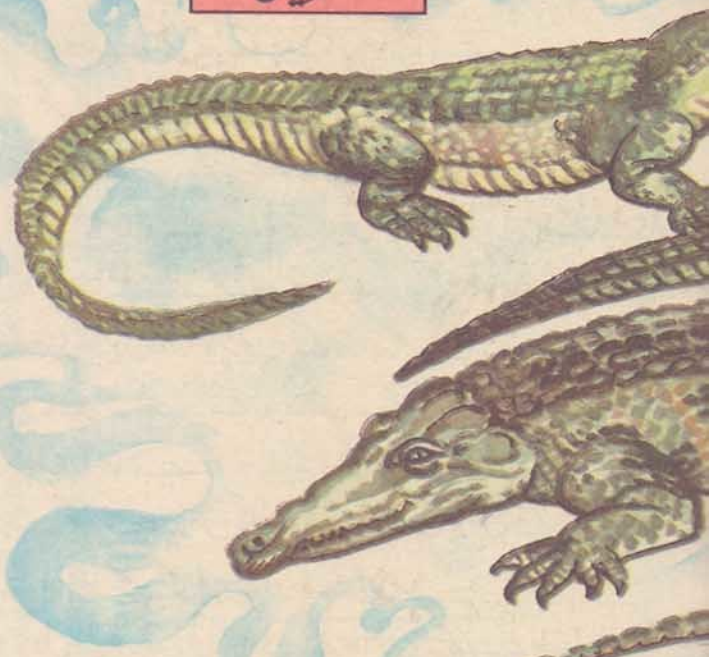

انڈے کا سائز مرغی کے انڈے جتنا ہوتا ہے۔ یعنی اس کی لمبائی تقریباً تین انچ ہوتی ہے۔ یہ بھی سفید اور بیضوی شکل کے ہوتے ہیں۔ ایک مادہ مگرمچھ 40 سے 70 تک انڈے دیتی ہے۔ مادہ مگرمچھ ان پر نہیں بیٹھتی بلکہ وہ پانی کے قریب ریت میں 2'3 فٹ گہرا گڑھا کھود کر 10'12 انڈے رکھ دیتی ہے اور اوپر ریت ڈال دیتی ہے۔ اس طرح کے کئی گڑھے کھود کر ان میں انڈے رکھتی اور اوپر ریت ڈالتی رہتی ہے۔ سورج کی تپش سے دسمبر کے مہینے میں بچے انڈوں سے نکلنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اگر ماں قریب ہو تو وہ ہر ایک گڑھے سے ریت ہٹا کر انڈوں سے بچے نکال لیتی ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو بچے خود ہی انڈے توڑ لیتے ہیں۔ پھر وہ ریت سے باہر نکل آتے ہیں۔

پیدائش کے وقت بچے کا سائز 7'8 انچ ہوتا ہے اور اس کے منہ میں پورے دانت ہوتے ہیں۔ قدرتی طور پر بچے پانی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ وہ انڈوں اور ریت سے نکل کر پانی کی طرف بھاگتے ہیں۔ یہ منظر عجیب و غریب اور نہایت دل چسپ ہوتا ہے۔ کہیں سے ریت اوپر کو اٹھتی ہے، اندر سے مگرمچھ کا ایک 7'8 انچ کا بچہ نکلتا ہے جو ننھی ننھی ٹانگوں پر پانی کی طرف تیزی سے دوڑتا ہے اور پانی میں جا کر غائب ہو جاتا ہے۔ دسمبر میں ریتلے ساحلوں سے بے شمار بچے دوڑتے اور پانی میں غائب ہوتے نظر آتے ہیں۔ بہت سے بچے پانی تک نہیں پہنچ پاتے۔ وہ راستے میں ہی سانپوں، چھپکلیوں اور پرندوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ان کی ماں ان کی تربیت میں کوئی سرگرمی نہیں دکھاتی۔ نہ انہیں دودھ پلاتی ہے اور نہ ہی انہیں تیرنا سکھاتی ہے بلکہ انہیں نظر انداز کر دیتی ہے۔ بچے بھی ماں کو نہیں ڈھونڈتے۔ البتہ ان کے والد ان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بچے ان کے لیے زود ہضم غذا ہوتی ہے۔ نر مگرمچھ کو جہاں کہیں اپنا نوزائیدہ بچہ نظر آتا ہے وہ اسے نگل لیتا ہے۔ یہ وہ غذا ہے جسے اسے گلنے سڑنے کے لیے کہیں دبانا نہیں پڑتا۔

قدرت مگرمچھ کے بچوں کی حفاظت کے جو انتظامات کرتی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ بچہ جوان ہونے تک جلد کا رنگ بدل سکتا ہے۔ ریت پر ہو تو اس کا رنگ ریت جیسا ہو جاتا ہے۔ کیچڑ میں کھیل رہا ہو تو رنگ کیچڑ جیسا اور جھاڑیوں میں ہو تو رنگ سبز ہو جاتا ہے۔ اس قدرتی وصف کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ بڑا مگرمچھ اسے ڈھونڈ نہیں سکتا۔

اس کی حفاظت کا دوسرا انتظام قدرت نے یہ کیا ہے کہ اسے دوسرے بچوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی حس عطا فرمائی ہے۔ مگرمچھوں کے بچے جوانی تک اکٹھے رہتے ہیں۔ اگر ان کے کچھ ساتھی بچھڑ جائیں تو یہ اس قدر شور بپا کرتے ہیں کہ تمام بچے دور دور سے آ کر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ بڑے مگرمچھ چھوٹے مگرمچھوں کے ہجوم

سے ڈرتے ہیں۔ اس لیے ان کے قریب نہیں آتے۔ جب بچے جوان ہو کر بڑے مگر مچھوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو ان کا آپس کا پیار ختم ہو جاتا ہے۔

بچپن میں مگر مچھ چیونٹیاں، کیڑے مکوڑے، چھوٹی مچھلیاں، چوہے اور مینڈک کھاتا ہے۔ ایک سال بعد اس کی لمبائی 18 انچ ہو جاتی ہے۔ جو 9 انچ سالانہ کے حساب سے بڑھتی ہے۔ جوانی میں یہ سات فٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس عمر میں اس کی جلد کا رنگ مستقل طور پر سیاہی مائل ہو جاتا ہے۔ مگر مچھ کی اوسط لمبائی تقریباً 15 فٹ ہوتی ہے۔ انتہائی لمبائی 18 فٹ بھی دیکھی گئی ہے۔ البتہ مادہ مگر مچھ کی لمبائی 13 فٹ تک رہتی ہے۔ مگر مچھ کا وزن 13 سے 15 من تک ہوتا ہے۔

مگر مچھ کئی سو سال تک زندہ رہتا ہے اور یہ ایک ایسا جانور ہے جو بوڑھا ہو کر نہیں مرتا۔ اس کی موت کسی شکاری کے ہاتھوں یا آپس میں لڑ کر واقع ہوتی ہے۔ مگر مچھ آدم خور ہی نہیں مگر مچھ خور بھی ہوتے ہیں۔ اگر ایک مگر مچھ زخمی ہو جائے تو دوسرے مگر مچھ حملہ کر کے اسے کھا جاتے ہیں۔ اگر جھیل خشک ہو جائے اور قریب کوئی جھیل نہ ہو تو مگر مچھ سرنگ بنا لیتا ہے جس کی لمبائی تقریباً 18 فٹ ہوتی ہے۔ سرنگ کے اندر والے سرے پر وہ کھلی جگہ بنا لیتا ہے اور وہاں خوراک اور پانی کے بغیر لمبے عرصے تک زندہ رہتا ہے۔ سرنگ کے باہر والے سرے کو بند رکھتا ہے۔ ڈیڑھ دو سال بعد بھی اگر جھیل میں پانی آ جائے تو وہ سرنگ سے باہر آ جاتا ہے۔ اگر پانی نہ آئے اور مگر مچھ کو بھوک تنگ کرے تو وہ باہر آ کر خشکی پر دور تک چلا جاتا ہے۔ اسے کوئی ساتھی مگر مچھ نظر آ جائے تو اس پر پل پڑتا ہے۔ ان کی لڑائی زندگی اور موت کی لڑائی ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ ایک دوسرے کو کھانے کے لیے لڑتے ہیں۔ جو مگر مچھ اپنے حریف کو ہلاک کرنے میں کام یاب ہو جاتا ہے وہ مرے ہوئے مگر مچھ کو گھسیٹ کر لے جاتا ہے اور کوئی موزوں جگہ ڈھونڈ کر اسے دبا دیتا ہے۔ جب یہ گل سڑ جاتا ہے تو اسے یہ فاتح مگر مچھ نگل لیتا ہے۔

مگر مچھ خاصا بزدل جانور ہے۔ اس کی یہ فطرت ہے کہ آمنے سامنے کی لڑائی سے ہمیشہ گریز کرتا ہے۔ یہ اتنا ڈرپوک ہوتا ہے کہ لڑائی سے اگر بھاگ نکلنے میں کام یاب ہو جائے تو لمبی مدت تک بھاگتا ہی رہتا ہے اور ایسے پانی کے قریب بھی نہیں جاتا جہاں کوئی اور مگر مچھ موجود ہو۔

دریا میں مگر مچھ کشتیوں پر حملہ کرتا ہے۔ اس حملے میں وہ اپنی دم استعمال کرتا ہے۔ کشتی والوں کو شک بھی نہیں ہوتا کہ ان کے نیچے ان کی موت تیرتی آ رہی ہے۔ وہ موزوں پوزیشن میں آ کر بجلی کی تیزی سے دم پانی سے باہر نکال کر اتنی زور سے کشتی پر مارتا ہے کہ کشتی ٹوٹ جاتی ہے۔ جو کشتی سوار دم کی زد میں آ جائیں وہ ہلاک ہو جاتے ہیں اور باقی پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ صرف وہی بچ پاتے ہیں جو تیرنا جانتے ہیں اور مگر مچھ کی پہنچ سے دور ہو جاتے ہیں۔

مگر مچھ جب شدید زخمی ہو جاتا ہے تو وہ مرنے کے لیے پانی کی تہ میں یا پانی سے نکل کر خشکی پر کہیں چلا جاتا ہے۔ وہاں آرام سے لیٹ جاتا ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد مر جاتا ہے۔ اگر پانی میں مرے تو 8، 10 دن تک تہ میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد اس کا مردار اوپر آ جاتا ہے اور کسی دوسرے مگر مچھ کے پیٹ میں چلا جاتا ہے۔

مگر مچھ کے معدے میں ہضم کرنے والے تیزاب اس قدر تیز ہوتے ہیں کہ اس کے پیٹ میں گینڈے کا سینگ تک گل جاتا ہے۔ جنگلی بھینسوں کے سینگ اور ہڈیاں ہضم کرنا تو اس کے لیے معمولی کام ہوتا ہے۔ اگر مگر مچھ کے پیٹ کو چاک کیا جائے تو پیٹ سے بڑی بڑی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کے علاوہ پتھر بھی نکلتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مگر مچھ کے پیٹ میں یہ پتھر کہاں سے آ گئے۔ مگر مچھ جو مچھلیاں کھاتا ہے۔ وہ دریا یا ندی کی تہ کے ساتھ ساتھ تیرتی ہیں۔ جب مگر مچھ جب اس مچھلی کا شکار کرتا ہے تو اس کے منہ میں مچھلی کے ساتھ پتھر بھی ہڑپ ہو جاتے ہیں۔

دل دلی اور قدرتی جھیلوں کے علاقوں کے رہنے والے ہندو مگر مچھ کو "جل دیوتا" سمجھتے ہیں۔ افریقہ میں اسے دریا کا دیوتا کہا جاتا ہے۔ سنگاپور اور ملایا وغیرہ کے جزیروں میں رہنے والے لوگ مگر مچھوں کو مچھلیاں کھلاتے ہیں پھر ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کے کسی انسان یا ان کے کسی مویشی کو نہ کھائیں لیکن مگر مچھ بھلا کب ان کی سنتے ہیں۔ جب بھی ان کے ہتھے کوئی انسان یا حیوان چڑھتا ہے، وہ اسے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اور ان کی منتیں اور دعائیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

سٹرابری کامکس

شاہد ریاض شاہد

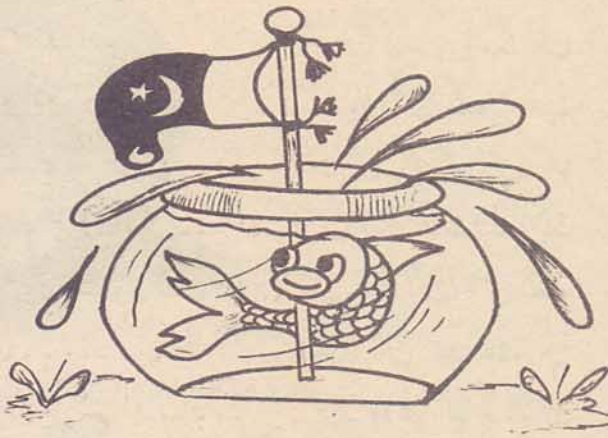

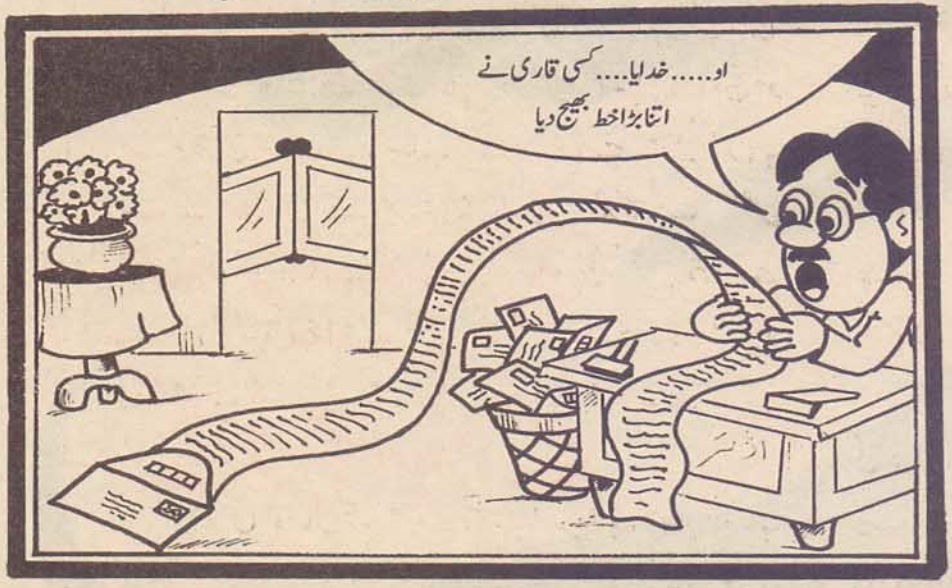

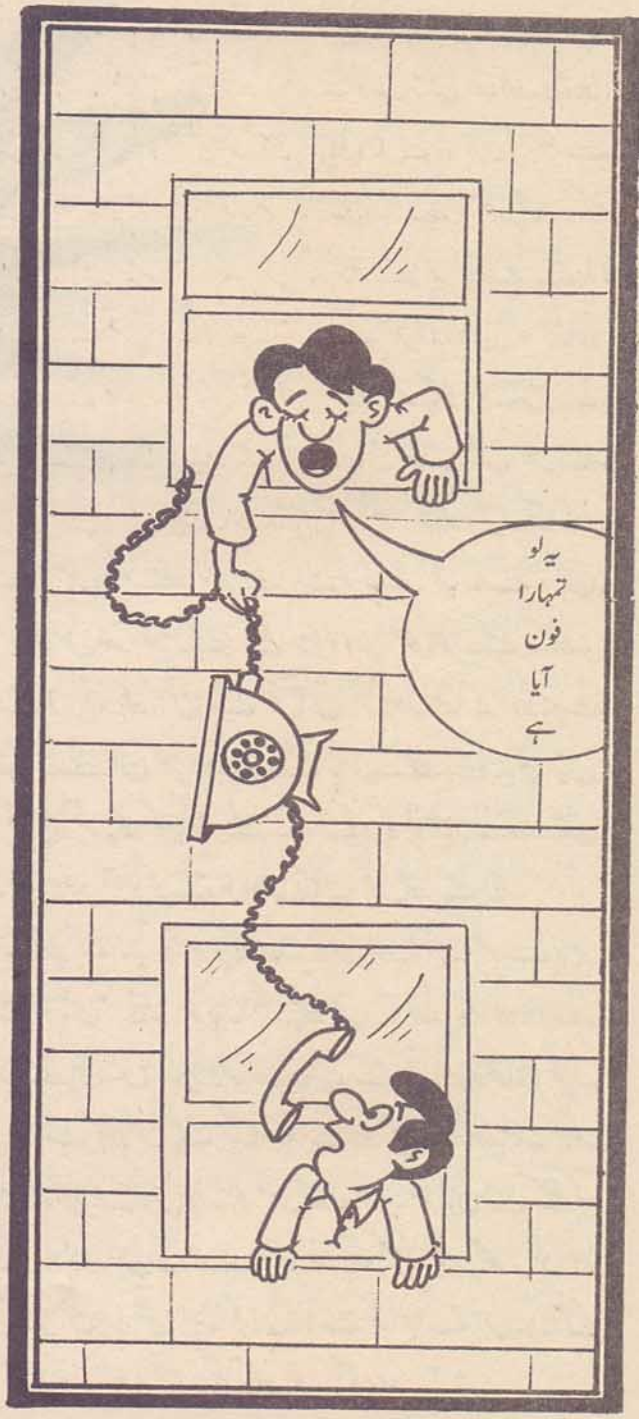

سلیم خاں گمی

موذیوں کے درمیان

مدت ہوئی ہالی وڈ کے ایک فلم ساز نے افریقہ میں مگر مچھوں پر فلم بنائی۔ یہ فلم جزوی طور پر مصر کے مشہور دریا 'نیل' کے حوالے سے وکٹوریا جھیل کی مرچی سن آب شار پر فلمائی گئی۔ اس فلم کے لیے مگر مچھوں کی تصویریں نہایت ضروری تھیں کیوں کہ فلم مگر مچھوں کے شکار اور تجارت پر تھی۔ ہیرو اور ہیروئن کی زندگیاں مگر مچھوں سے بچانے کے لیے ضروری تھا کہ پیشہ ور شکاریوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ چناں چہ دو پیشہ ور شکاریوں، ڈکر اور سڈنی کو فلم کمپنی نے ملازم رکھا۔ میں ان کا معاون تھا۔

فلم میں مگر مچھوں کے شکار کے کئی مناظر تھے۔ ایک منظر میں ہیرو ایک بڑے مگر مچھ کا شکار کرتا ہے اور اس کی پشت پر پاؤں رکھ کر تصویر اتروا تا ہے۔ چناں چہ طے یہ ہوا کہ ایک بہت بڑے مگر مچھ کو شکار کیا جائے تاکہ تصویر کشی ہو سکے۔ مگر مچھ کے شکار کے لیے مجھے کہا گیا۔ چناں چہ میں نے ایک موٹے تازے اور بد شکل مگر مچھ کی تلاش شروع کی۔ دریائے نیل کے پانی میں مجھے حسب خواہش مگر مچھ مل گیا جس کو میں نے شکار کیا۔ میں نے گولی اس کے دماغ میں پیوست کی تھی۔ وہ مر گیا تو الٹا ہو گیا۔ اب اس کا پیٹ اوپر دھوپ میں تھا اور پشت پانی میں۔

میں نے مگر مچھ کو کنارے پر لانے کے لیے مزدوروں کو اشارہ کیا۔ مگر مچھ کو میں نے دریائی گھاس میں کھڑے ہو کر شکار کیا تھا اور مزدور میرے ساتھ تھے۔ مزدور اسے لے کر آگئے۔ ان میں ایک موٹا مزدور تھا جسے باقی مزدور مغوطو کہتے تھے۔ یعنی موٹا آدمی (موٹو)۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بہت ڈرپوک ہے۔ رسے ان مزدوروں کے پاس تھے۔ وہ پانی میں کھڑے تھے لیکن مگر مچھ کو باندھنے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ میں غصے میں آکر مزدوروں کو کوسنے ہی والا تھا کہ مگر مچھ ہلنے لگا۔

"یا خدا! یہ کیا؟ یہ تو مر چکا تھا۔ خون اور مغز زخم سے باہر رس رہے تھے" میں نے سوچا۔ مگر مچھ ہل رہا تھا۔ پھر وہ اور زور سے ہلنے لگا۔ پہلے پانی میں الٹا پڑا تھا اب پیٹ کے بل سیدھا ہو گیا۔ پھر وہ مڑا اور سوفٹ تیر کر ایک جگہ ساکت ہو گیا۔ پھر اچانک چکر کاٹنے لگا۔ تیز.... تیز.... اور تیز۔ جو مگر مچھ ادھر ادھر پانی میں تھے وہ اس کے خون کی بو پا کر اس کی طرف آنے لگے۔ اگر مگر مچھ زخمی ہو جائے تو اس کے سنگی ساتھی حملہ کر کے اسے کھا جاتے ہیں۔ کیوں کہ مگر مچھ "آدم خور" ہی نہیں مگر مچھ خور بھی ہوتے ہیں۔

چکر کاٹتے ہوئے "مردہ" مگرمچھ نے اچانک کنارے کا رخ کیا اور جہاں ہم کھڑے ہو کر اسے دیکھ رہے تھے وہاں سے کچھ دور ساحل کے کنارے آلگا۔ اب وہ واقعی مرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ مزدور اس پر پتھر پھینکنے لگے۔ پتھر کھا کر اس نے کوئی جنبش نہ کی۔ موٹے تازے مزدور نے اپنا ڈر چھپا کر یہ بتانے کے لیے کہ وہ دلیر ہے' اس کی دم کو پکڑا۔ 12 فٹ لمبا یہ مردہ مگرمچھ پھر زندہ ہو گیا۔ اس نے دم کو زور سے جھٹکا دیا اور موٹو دھڑام سے گرا۔ دوسرے مزدوروں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔

مگرمچھ نے ایک بار پھر پانی میں ڈبکی لگائی اور گہرے پانی کی طرف چلا۔ پھر چکر کاٹنے لگا۔ اس نے پانی میں تین چار چکر لگائے۔ اس کے بعد پھر تیزی سے کنارے کی طرف آیا اور کھڑا ہو گیا۔ اب کسی مزدور نے جرات نہ کی کہ اسے چھیڑے یا پتھر مارے۔ البتہ میں نے اٹھ کر اس کے مغز کے اندر چھڑی رکھی۔ اس نے ٹس سے مس نہ کی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اب واقعی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ میری گولی نے اس کے مغز کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسی وقت مر گیا تھا۔ وہ اس وقت بھی مر چکا تھا جب تیر رہا تھا۔ وہ مردہ حالت میں چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ جب تارپیڈو کی طرح کنارے کی طرف آتا تھا اور کھڑا ہو جاتا تھا تو اس وقت بھی مرا ہوا تھا۔ اس کی ساری حرکات اعصابی اور عضلاتی تھیں' دماغی نہ تھیں۔ دماغ تو گولی لگنے سے ختم ہو گیا تھا۔ بعض رینگنے والے جانور مثلاً اژدہا وغیرہ موت کے بعد بھی اعصابی اور عضلاتی طور پر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال فلم کے سین کا جو تقاضا تھا وہ اس مگرمچھ نے پورا کیا اور میں سرخ رو ہوا۔

یہ فلم اس رجحان کی عکاس تھی کہ امریکا اور یورپ کے لوگ مگرمچھ کی کھال کو ایک نہایت قیمتی تحفہ خیال کرتے ہیں۔ یہ خیال اب بھی موجود ہے اور امریکی اور یورپی خواتین اب بھی مگرمچھ کی کھال کے تیار کیے ہوئے بٹوے' ٹوپیاں' فلیٹ' بیلٹ' اسکارف' جوتے' سوٹ کیس اور کوٹ بھاری قیمت دے کر خریدتے ہیں۔ ایشیا میں چیتے اور برفانی چیتے کی کھال کو جو اہمیت حاصل ہے' یہی اہمیت افریقی ملکوں میں مگرمچھ کی کھال کو حاصل ہے۔

اس فلم میں مگرمچھ کا شکار کرتے ہوئے ایک شکاری پر مگرمچھ کا حملہ دکھانا بھی مقصود تھا۔ چناں چہ میں نے ایک ایسے شخص کو تلاش کیا جس کا نام سلاس تھا اور جس کی ایک ٹانگ مگرمچھ چبا چکا تھا۔ سلاس قبائلی تھا اور کشتی چلاتا تھا۔ یہ چھوٹی سی کشتی تھی جس میں بیٹھ کر سلاس سیاحوں کو جھیل کی سیر کرواتا تھا۔ یہ مگرمچھوں سے شدید نفرت کرتا تھا اور اٹھتے بیٹھتے مگرمچھوں کے خاتمے کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ اس کی ٹانگ لڑکپن میں مگرمچھ نے چبا ڈالی تھی اور اب وہ بیساکھیوں سے چلتا تھا۔ ایک دن میں نے دریا کے کنارے لیٹے ہوئے مگرمچھوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ گولیوں کے اندر جانے اور باہر نکلنے کے نشانات صاف اور واضح تھے۔ خون اور مغز مگرمچھ کے جسم سے باہر آگئے۔ میں مگرمچھ کے دانت دیکھنا چاہتا تھا۔ چناں چہ سلاس کی بیساکھی کو اس کے جبڑوں میں ڈالا تاکہ جبڑے کھل جائیں اور میں دانت دیکھ سکوں۔ کڑک کی آواز آئی اور بیساکھی دو ٹکڑے ہو گئی۔ مگرمچھ کے فولادی جبڑے بند ہو گئے اور دم تیز تیز ہلنے لگی۔ پھر اس کی ٹانگوں میں حرکت ہوئی اور وہ پانی میں روانہ ہوا۔ حال آں کہ وہ مر چکا تھا۔ سلاس نے میری بندوق سے اس کے جسم پر دو تین فائر کیے اور زمین پر بھاگتے مگرمچھ کی دم زور لگا کر پکڑی تب اس کا جسم ٹھنڈا ہوا۔ سلاس بولا: "مراد صاحب! اس طرح سے مگرمچھ نے میری ٹانگ چبائی تھی"

ایسا سین حقیقی معنوں میں فلمانا جان جوکھوں کا کام تھا' اس لیے اسے فلم سے نکال دیا گیا۔ اس سین میں ناکامی ہوئی تو فلم ساز کمپنی کے مالکان نے پیشہ ور شکاریوں کے ساتھ مل کر اس فلم کے دیگر سین فلم بند کرنے کے لیے کوئی نیا انداز اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

"مراد خان صاحب' آپ کو ہمارے اس نئے پروگرام میں بڑا اہم کردار ادا کرنا ہوگا" پیشہ ور شکاری سڈنی نے کہا۔

"مجھے کیا کام کرنا ہوگا؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"آپ ہماری معاونت کریں گے" ڈک نے کہا۔

"کام کیا ہوگا؟ اس کی نوعیت کیا ہوگی" میں نے پوچھا۔

"ہم آب شار کے ساتھ یا قریب ایک مصنوعی جھیل بنائیں گے تاکہ اس میں مگرمچھوں کو دریا یا آب شار میں راتب کے لالچ میں گھیر کر لا سکیں اور پھر فلم والے ان مگرمچھوں کی

تصویریں لے سکیں" ڈکر نے بتایا۔

"آپ نے کہا لالچ' کون سا لالچ دیں گے آپ مگر مچھوں کو؟" میں نے پوچھا۔

"ہم زیبرے' زرافے' مرگ' چیتل اور آبی ہرن مار کر مصنوعی جھیل میں ڈالیں گے اور مگر مچھ بو سونگھ کر ان کا گوشت کھانے کے لیے آئیں گے" سڈنی نے جواب دیا۔

مصنوعی جھیل یعنی مصنوعی آبی باڑے کی تعمیر شروع ہوئی۔ سیکڑوں ترکھانوں، لوہاروں اور مزدوروں نے دن رات کام کیا اور جھیل تیار ہو گئی۔ مصنوعی جھیل اور اصلی وکٹوریہ جھیل میں دریائے نیل کا پانی تھا۔ دریائے نیل اور وکٹوریہ آب شار کے اردگرد جتنے مگر مچھ تھے وہ زیبروں' زرافوں' مرگوں' چیتلوں اور آبی ہرنوں کے گوشت کی بو سونگھ کر مصنوعی جھیل کا رخ کرنے لگے اور ایک ہفتے کے اندر اندر مصنوعی جھیل مگر مچھوں سے بھر گئی۔ زیبرے' زرافے' مرگ' چیتل اور پانی میں رہنے والے ہرن سڈنی ڈکر اور میں شکار کر کے لاتے تھے اور فلم کمپنی سے ان کی قیمت وصول کرتے تھے۔

اب مصنوعی جھیل کو دریائے نیل اور وکٹوریا آب شار سے لکڑی کے پرتوں کے ذریعے الگ کر دیا گیا۔ فلم ڈائریکٹر نے کیمرے نصب کئے اور مقررہ وقت پر ایکشن کا حکم دیا۔ ایکشن کا حکم اور دوسرا شور کیمرہ مینوں نے نہ سنا البتہ مگر مچھوں نے خوب سنا۔ مگر مچھ قدرتی طور پر ڈرپوک ہوتے ہیں۔ اب جو شور اٹھا تو وہ ہڑبڑا کر دریائے نیل اور آب شار کی طرف بھاگے۔ اس سے شور میں اور شدت آئی۔ لکڑی کے پرتوں سے بنائی گئی باڑ گر گئی اور مگر مچھ بھاگنے لگے۔ لکڑی کی باڑ پر کیمرہ مینوں اور کیمروں کے کھڑے ہونے کے لیے جگہیں تیار کی گئی تھیں۔ ظاہر ہے باڑ گری تو ساتھ کیمرہ مین بھی گرے اور ان کے ساتھ کیمرے بھی۔ خطرہ پیدا ہو گیا کہ مگر مچھ کیمرہ مینوں کو ہڑپ کر جائیں گے۔ کیمرے تو مل سکتے ہیں' خریدے جا سکتے ہیں لیکن کیمرے والوں کا کیا بنے گا۔ چناں چہ ڈکر اور سڈنی نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ پتا نہیں کتنے مگر مچھ مرے یا زخمی ہوئے البتہ کیمرہ مین بچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے مگر مچھ دریائے نیل کے پانی میں گم ہو گئے۔ فلم کی شوٹنگ بند ہو گئی۔ میں نے فلم کے پروڈیوسر سے اپنا معاوضہ لیا اور اپنے کیمپ کی طرف چلا۔

میرے ساتھ میرے دو نوکر بھی تھے۔ میرا سفر وادی نیل میں سے تھا۔ سورج غروب ہو گیا تھا اور چاروں طرف اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں سارا دن کام کرتا رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ جلدی سے اپنے کیمپ میں پہنچ جاؤں۔ غسل کروں' کافی پیوں اور آرام کروں۔ دریائے نیل کو پل کے ذریعے پار کیا جاتا تھا پھر ہمارا کیمپ آتا تھا لیکن ایک چھوٹا راستہ بھی تھا اور وہ دل دل کا راستہ تھا۔ دل دل کو عبور کرنے پر ہمارا کیمپ سامنے نظر آجاتا تھا۔ میں نے دل دل والا راستہ اختیار کیا۔ میرے ایک نوکر نے کہا:

"مراد سائیں' یہ دل دل کا راستہ ہے"

"ہاں' میں جانتا ہوں' یہ دل دل کا راستہ ہے" میں نے کہا۔

"یہ صاف راستہ نہیں ہے" وہ بولا۔

"ہاں' یہ صاف راستہ نہیں ہے' گندا راستہ ہے" میں نے اسے بتایا۔

"یہ گندا اس لیے ہے کہ دل دل کے پانی میں مگر مچھ ہوتے ہیں" وہ بولا۔

"اس وقت مگر مچھ شکار نہیں کرتے' آرام کرتے ہیں" میں نے اسے بتایا۔

"مراد سائیں' ان کا کوئی اعتبار نہیں" وہ نوکر سیانے آدمی کی طرح بولا۔

"گھبراؤ نہیں' چلے آؤ' کچھ نہیں ہو گا" میں نے کہا اور چلتا رہا۔ دل دل آگئی۔ اس میں پانی بھی تھا اور جھاڑ جھنکاڑ بھی۔ میں آگے تھا۔ میں نے دل دل میں پیر رکھا۔ شام کے دھندلکے میں مجھے محسوس ہوا کہ دل دل اور اس کا پانی خراب ہے۔ نوکروں نے اپنی بولی میں کہا "یہ جگہ اچھی نہیں"

ان کی بات سن کر میرا ارادہ اور پختہ ہو گیا اور میں چل پڑا۔ وہ میرے پیچھے آرہے تھے۔ وہ بھی دل دل پانی میں اتر کر چلنے لگے۔ ہمارے چلنے سے چھپڑ چھپڑ کی آوازیں خاموشی کو چیرنے لگیں۔ دل دل میرے وہم و گمان سے زیادہ خراب نکلی۔ میں اس راستے پر چل رہا تھا جس پر دریائی گھوڑے چلتے رہے تھے۔ دل دل کے اندر

گہرے کھڈ بھی تھے۔ ہم خاموشی سے چل رہے تھے۔ اب چھپڑ چھپڑ کی آوازیں بھی مدہم تھیں۔ آدھی دل دل پار کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہم باقی آدھی دل دل آسانی سے پار کر لیں گے۔ میرے سامنے ایک درخت گرا پڑا تھا۔ وہ آدھا دل دل کے پانی میں ڈوبا تھا اور آدھا پانی میں اگنے والی ہری گھاس میں تھا۔ میں تھکا ہوا تو تھا ہی اب دل دل پار کرتے ہوئے اور تھک گیا تھا۔ میں نے سوچا درخت پر بیٹھ کر ذرا ستا لوں۔ چناں چہ میں نے بیٹھنے کے لیے اس پر پاؤں رکھا۔

یہ درخت نہ تھا' یہ تو ایک بہت ہی موٹے تازے مگرمچھ کی پشت تھی۔ ہم دونوں بہ یک وقت گھبرا گئے۔ غالباً مگرمچھ سے زیادہ میں گھبرایا۔ کیوں کہ مگرمچھ مجھ پر حملہ کر سکتا تھا لیکن میں فائر کرنے سے قاصر تھا۔ اس نے زور سے سانس لیا اور مجھے پٹخنی دے کر دل دلی پانی میں گرا دیا۔ وہ خود تیزی سے چھپڑ چھپڑ کرتا ہوا دریا کی طرف لپکا۔ میں گرا تو میری بندوق بھی میرے ساتھ نیچے گر گئی۔ لیکن میں نے اپنے اوسان خطا نہ کیے اور پیروں پر کھڑا ہو کر پھر چل پڑا۔ اب جو دیکھا تو میں درجن بھر بڑے بڑے موذی مگرمچھوں اور گھڑیالوں کے درمیان تھا۔ یہ بھی دریا کی طرف نکل جانے والے مگرمچھ کے ساتھی تھے۔ وہ سب رات گزارنے کے لیے ایک جگہ اکٹھے ہو کر آرام کر رہے تھے۔ مجھے اپنے درمیان پا کر وہ بھی دریا کے پانی کی طرف چل پڑے۔ وہ مجھ سے ڈر گئے تھے۔ لیکن جاتے جاتے ایک بہت بڑے مگرمچھ نے اپنا منہ میری ٹانگ پر مگدر کی طرح مارا اور مجھے پریشان کر دیا۔ میں مشکل سے سنبھلا تھا کہ ایک اور موٹا تازہ مگرمچھ اپنے جبڑے کھول کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ وہ میرے قریب آیا' اتنا قریب کہ اس کے جبڑوں سے نکلنے والی سڑاند میرے نتھنوں میں گھس گئی۔ میں نے اس کے دانت بھی دیکھے جو تین انچ لمبے تھے۔ میں نے اپنی بندوق کا کندہ زور سے اس کے جبڑوں پر مارا اور وہ پلٹا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ دریا کی طرف چل پڑا۔ یوں میری اس موذی سے جان بچی۔ میرے پیچھے آنے والے میرے دو نوکروں نے اوسان خطا نہ کیے۔ وہ ڈر گئے تھے لیکن میرے پیچھے چلتے رہے اور آخر کار ہم دل دل پار کر کے کنارے پر ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ دیکھا تو دور ہمارے کیمپ کی آگ جل رہی تھی۔ ستانے کے بعد ہم اس طرف چل دیئے۔

گو اب میں اپنے وطن پاکستان واپس آچکا ہوں مگر میری زندگی کے وہ لمحات جو ان موذی جانوروں کے درمیان گزرے مجھے آج تک یاد ہیں۔

* * *

منحی: (گھاس پر شبنم پڑی دیکھ کر): امی، آج کل کتنی گرمی پڑ رہی ہے۔

امی: ارے پگلی جنوری میں گرمی کہاں؟

منحی: یہ گرمی نہیں تو کیا ہے؟ گھاس کو بھی پسینہ آرہا ہے

(ارسلان جاوید چک خاصہ جہلم)

لڑکا (دودھ والے سے): ایک سیر بھینس کا دودھ دے دو۔

دودھ والا: تمہارا برتن چھوٹا ہے۔

لڑکا: تو بکری کا دودھ دے دو

(سائرہ الطاف لاہور)

ایک شخص کے بیٹے کی کمر جھک گئی۔ وہ اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر لڑکے کو لے کر کمرے میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکا کمرے سے باہر آیا تو بالکل ٹھیک تھا۔ آدمی نے ڈاکٹر سے پوچھا "اسے کیا بیماری تھی؟"

ڈاکٹر: پہلے پانچ سو روپے دو پھر بتاؤں گا۔ آدمی نے رقم دے دی تو ڈاکٹر نے کہا۔ "اصل میں آپ کے بیٹے نے غلطی سے اپنی پتلون کا بٹن قمیض کے کاج میں بند کر لیا تھا۔

(طیبہ عزیز مغل حسن ابدال)

جج (ملزم سے): کل صبح تمہیں پھانسی دی جائے گی۔

ملزم (چیخ کر): نہیں نہیں، اس طرح تو میں مر جاؤں گا

(علی کامران ملتان)

ایک خادمہ ایک امیر گھر کی عورت کے پاس نوکری کے لیے آئی تو عورت نے پوچھا "تمہیں پہلی ملازمت سے کیوں نکالا گیا؟"

ملازمہ: میں ان کے بچوں کو نہلانا بھول جاتی تھی۔

پاس کھڑے بچے بیک وقت بولے۔ "اماں، یہی خادمہ اچھی ہے۔ اسے ضرور رکھیں"

(حبیبہ نقی راول پنڈی)

"سیٹھ جی! تعجب ہے، آپ اتنے گھٹیا ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں جب کہ آپ کا بیٹا تو جب ادھر آتا ہے یہاں کے سب سے مہنگے ہوٹل میں ٹھہرتا ہے" سیٹھ کے ایک دوست نے ان سے کہا۔

سیٹھ جی نے سکون سے بات سنی اور بولے "ہاں، میرے بیٹے کی بات اور ہے۔ وہ مہنگے ہوٹل میں ٹھہر سکتا ہے کیوں کہ اس کا باپ ایک سیٹھ ہے مگر میرا باپ مر چکا ہے

(عبدالمالک شرق پور)

کنجوس باپ (بیٹے سے): بیٹے کیا کر رہے ہو؟

بیٹا: کچھ بھی نہیں

باپ: کچھ لکھ رہے ہو گے؟

بیٹا: جی نہیں پاپا

باپ (غصے سے): تو پھر چشمہ اتار کیوں نہیں دیتے؟ لگتا ہے تمہیں فضول خرچی کی عادت پڑ گئی ہے

(محمد ابو بکر ڈھولن چک نمبر 7)

ایک آدمی موٹر سائیکل کی دکان پر گیا اور کہا "جناب آپ نے تو کہا تھا کہ موٹر سائیکل چلاتے ہوئے جو چیز ٹوٹ گئی ہم نئی لگوا کے دیں گے"

دکان دار نے پوچھا "کیا ٹوٹا ہے"

آدمی نے جواب دیا "سامنے والے چار دانت"

(زاہد مظہر ذوالفقاری شکر درہ)

مزدور

ضیغم حمیدی

بچوا میں ہوں اک مزدور
مفلس، بے بس اور مجبور
گرمی ہو یا ہو برسات
محنت کرتا ہوں دن رات
لاغر اور تھکن سے چور
بچوا میں ہوں اک مزدور

تھوڑی اجرت پا کر بھی
کام زیادہ کرتا ہوں
پورا کر کے رہتا ہوں
جو بھی ارادہ کرتا ہوں
برے ہیں کیوں میرے حالات
کس سے کہوں میں دل کی بات
منزل میری کوسوں دور
بچوا میں ہوں اک مزدور

دن تو مناتے ہیں ہر سال
لوگ یہاں مزدوروں کا
کوئی نہیں لیکن ساتھی
ہم دکھیارے لوگوں کا
خیرا جو قدرت کو منظور
بچو میں ہوں اک مزدور

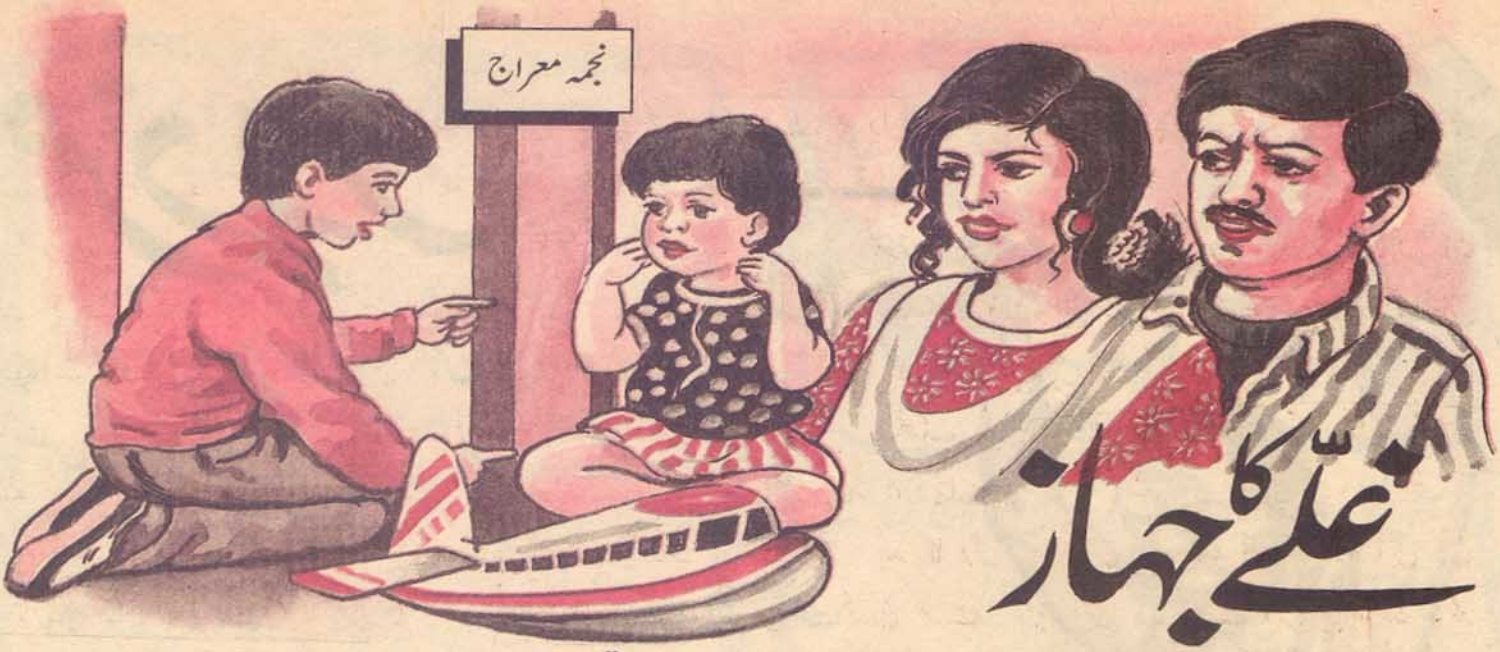

علّے کا جہاز

نجمہ معراج

سعد اور اسد دو بھائی تھے۔ ان کے والدین پڑھے لکھے تھے۔ والدہ ایک اسکول میں پڑھاتی تھیں جب کہ والد ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ ان کا گھر کافی صاف ستھرا تھا۔ ماں کو ملازمت کی وجہ سے گھر کے کام کاج میں کسی سے مدد لیتی پڑتی تھی۔ اس نے گھر کی صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے ایک عورت رکھی ہوئی تھی۔ اس عورت کے پانچ بچے تھے۔ بڑے تین بچے اسکول چلے جاتے جب کہ چھوٹے دو بچے ماں کے ساتھ ہی رہتے۔ جس گھر میں وہ کام کرتی یہ دو بچے بھی وہیں اس کے پاس کھیلتے رہتے۔

سعد 7 سال کا تھا اور اسد 3 سال کا۔ سعد کے والد بچوں کے لیے بہت سے کھلونے لاتے۔ سعد قیمتی سے قیمتی کھلونے کے ساتھ چند گھنٹے کھیلتا پھر اس کا پورا پوسٹ مارٹم کر دیتا۔ ماں باپ کے منع کرنے کے باوجود اگر وہ کچھ دیر صبر کرتا بھی تو اگلے دن ان سے چوری چھپے کھلونے کی توڑ پھوڑ شروع کر دیتا۔ ماں اور باپ اس کی اس حرکت سے بہت پریشان تھے۔ اگر سعد کے ہاتھوں سے کوئی کھلونا بچ جاتا تو کام کرنے والی ماسی کے بچے اس کو غائب کر دیتے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ سعد کو کھلونوں کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔

ایک دن سعد، اسد اور ان کے والدین بچوں کے چاچو کے گھر گئے۔ چاچو سلیم کے بچوں نے ایک کمرا کھلونوں سے سجا رکھا تھا۔ کمرے کے اندر دیوار میں بہت بڑی شیشے کی الماری تھی۔ اس میں بھی بہت سے کھلونے سجے ہوئے تھے۔ ان کھلونوں میں بہت پرانے کھلونے بھی تھے۔ وہ گاڑی بھی کھلونوں میں محفوظ تھی جو ان کے دادا ابو نے چاچو سلیم کو ان کی پہلی سال گرہ پر دی تھی۔ چاچو سلیم کے بیٹے انور کی یہ عادت ہے کہ ہر کھلونے سے کھیلنے کے بعد اسے محفوظ کر لیتا ہے۔ سعد کے والد اور والدہ کو انور کی یہ عادت بہت اچھی لگی ۔جب کہ وہ سعد کی کھلونوں کو توڑنے والی عادت سے بہت تنگ آ چکے تھے۔

سعد کے والدین نے گھر آکر ایک دوسرے سے کھلونوں سے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ پھر پتا نہیں سعد کی امی اور ابو نے کیا خفیہ فیصلہ کیا بہرحال اس دن کے بعد سعد کے گھر کبھی کوئی کھلونا نہ آیا۔ کوئی چھ ماہ گزرنے کے بعد بچوں کے پاس سے سب کھلونے ختم ہو گئے۔ حتیٰ کہ گھر میں کھلونوں کا کوئی ٹکڑا بھی نہ بچا۔

ایک روز سعد اسکول سے واپس آرہا تھا تو راستے میں میلہ لگا ہوا تھا۔ اس کے تقریباً سب ہم جماعت دوستوں نے کھلونے خریدے۔ سعد کو ایک کھلونا جہاز بہت پسند آیا۔ اس نے اپنے والد سے کہا کہ وہ اسے جہاز خرید دیں۔ انہوں نے کہا "سعد بیٹے' مین آپ کو جہاز ہرگز نہیں خرید کر دوں گا"۔

"کیوں ابو؟ آپ نے مجھے جہاز کیوں نہیں خرید کر دینا؟" ابو کے اس غیر متوقع انکار پر سعد نہ صرف شرم سار سا ہو گیا بلکہ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا "پہلے تو آپ مجھے اتنے کھلونے لے کر دیتے تھے اور اب ایک کھلونا بھی نہیں لے کر دیتے؟"

"بیٹا' آپ کی بری عادت کی وجہ سے نہیں لے کر دیتا۔ کھلونے کو اس کے خریدنے کے اگلے دن ہی اسے ختم کر دیتے ہو۔ جس سے مجھے بہت دکھ ہوتا ہے"۔

سعد کہنے لگا "ابو مجھے جہاز لے دیں' اب میں اسے نہیں توڑوں گا"۔

سعد کے والد نے جواب دیا "میرا آپ کی امی سے وعدہ ہے کہ میں اب سعد کو کوئی کھلونا نہیں لے کے دوں گا"۔

اتنے میں سعد بولا "میں امی جان سے کہوں گا کہ مجھے جہاز لے دیں"۔

باپ کو سعد کی جہاز لینے کی خواہش نہ پوری کر سکنے پر بہت ترس آیا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس نے جہاز لے کر ایک دو بار ہی چلانا ہے پھر یقیناً توڑ پھوڑ دے گا۔ لیکن وہ اس کے باوجود اپنے بیٹے کو جہاز لے کر دینا چاہتے تھے مگر وہ سعد کی امی سے کیے گئے وعدہ کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

باپ نے جب سعد کی یہ بات سنی کہ میں امی سے کہوں گا کہ مجھے جہاز لے دیں' تو باپ نے جواب دیا کہ "کھلونوں کی توڑ پھوڑ والی عادت سے آپ کی ماں بہت تنگ ہے۔ وہ آپ کو کھلونا جہاز نہیں لے کے دیں گی۔ ہاں اگر آپ نے ضرور ہی جہاز خریدنا ہے تو بیٹے میں آپ کو ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ آپ کے پاس جو غلہ پڑا ہوا ہے' اسے توڑو اور اس میں سے جو پیسے نکلیں اس کا جہاز خرید لینا۔

یہ بات سن کر سعد گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے ابو دل ہی دل میں اس کی حالت دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد سعد اپنے ابو کے پاس اپنا غلہ لے آیا اور بولا "ابو جان، اس میں سے پیسے نکال کر مجھے ابھی جہاز لا دیں"۔

"ٹھیک ہے بیٹا' مجھے پیسے نکال کر دو' میں تمہیں ابھی جہاز لا دیتا ہوں"۔

سعد کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی جمع پونجی خرچ کرے لیکن اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر غلہ توڑ لیا اور سارے پیسے اکٹھے کر کے اپنے ابو کو دے دیئے۔ پیسے دیتے ہوئے سعد کا چہرہ بہت افسردہ تھا۔ اس کے ابو اگر کچھ بھی بولتے تو شاید وہ رو ہی پڑتا۔ وہ اسی لمحے بازار گئے اور سعد کو کھلونا جہاز لا کر دے دیا۔ سعد نے تھوڑی دیر جہاز کو صحن میں خوب اڑایا پھر اسے اسی ڈبے میں ڈالا جس میں سے نکالا تھا اور برتنوں والے شو کیس میں رکھ دیا۔ سعد کے ابو اور امی اس تبدیلی پر بہت خوش ہوئے۔

اگلی دوپہر سعد کے امی ابو کھانے سے فارغ ہو کر سو گئے۔ سعد اسد اور ماسی کے دونوں بچے آپس میں کھیلنے لگے۔ اچانک اسد کے زور زور سے رونے کی آواز سعد کی امی کے کانوں میں پڑی۔ وہ فوراً اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئیں۔ اسد کے دانتوں میں سے خون نکل رہا تھا۔ اتنے میں ماسی بھی باورچی خانے سے اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ اسد مسلسل روئے جا رہا تھا۔ اسد کو روتے اور خون آلود دیکھ کر چھوٹے بچے نے بھی رونا شروع کر دیا۔ ماں نے اسد کا خون صاف کیا اور چوٹ کی وجہ پوچھی۔ اسد نے روتے ہوئے بتایا کہ اسے سعد نے مارا ہے۔ ماں بہت حیران ہوئی کہ سعد نے اس قدر مارا کہ خون نکلنے لگ پڑا۔ ماں نے سعد کو ڈانٹا اور پاس بلا کر پوچھا "تم نے اسد کو اس قدر کیوں پیٹا ہے؟"

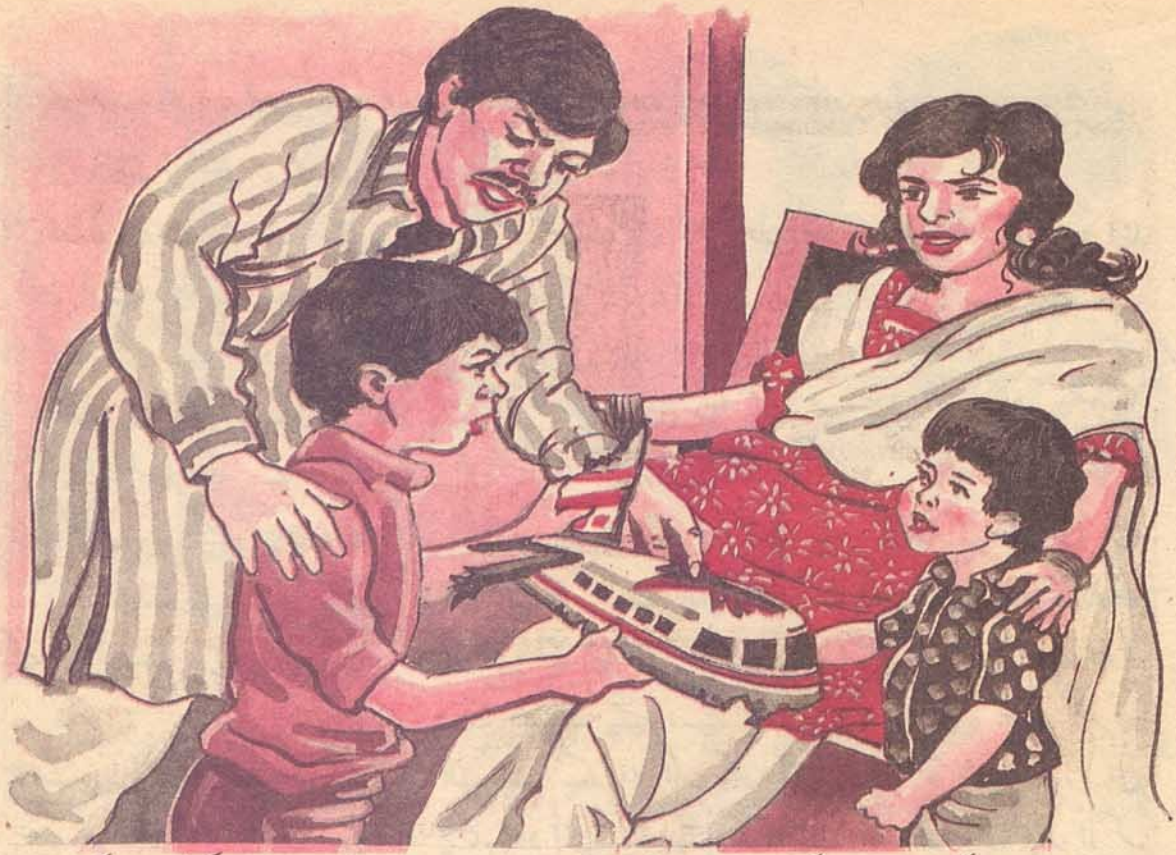

سعد بھی رونے لگ پڑا اور پھر روتے ہوئے جہاز والا ڈبا اپنی امی کے پاس لے آیا جس کے اندر سے اس نے ٹوٹا ہوا جہاز نکالا اور امی کو دکھاتے ہوئے کہا "یہ دیکھیں! امی جان' اسد نے میرا جہاز توڑ کر چکنا چور کر دیا ہے۔ اس کی لائٹیں بھی توڑ دی ہیں۔ میں نے سارے سال کا جیب خرچ جمع کر کے یہ جہاز خریدا تھا اور اسد نے ایک منٹ میں توڑ دیا ہے"۔

یہ بات کہہ کر سعد پھر غصے میں آگیا اور پاس کھڑے اسد کی طرف یوں بڑھا جیسے اسے جان سے ہی مار دے گا۔ "اس نے میرا جہاز توڑ دیا ہے۔ میں نہیں چھوڑوں گا اسے" اس نے چیختے ہوئے کہا۔

یہ سارا ماجرا ان کے ابو بھی سن رہے تھے۔ انہوں نے جلدی سے سعد کو پکڑ لیا اور دوسرے کمرے میں لے جا کر کہنے لگے "دیکھو بیٹا' یہ تمہارا اپنے پیسوں سے خریدا ہوا کھلونا تھا تو تمہیں ٹوٹ جانے کا اس قدر دکھ ہوا ہے کہ اسد کو جان سے مارنے پر تلے ہوئے ہو۔ جب میں تمہارے لیے اتنے قیمتی کھلونے لاتا تھا اور تم اسی وقت توڑ دیتے تھے تو ہم نے تو کبھی بیٹا نہیں تھا۔ حال آں کہ ہمیں بھی اسی قدر دکھ ہوتا تھا۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ کیوں کہ ہم تو سارا مہینا دفتروں میں کام کر کے تھک جاتے ہیں تو پھر کہیں جا کر پیسے ملتے ہیں' تمہارا تو صرف جیب خرچ ہی تھا جس سے تم اپنے بھائی کو جان سے مارنے کو کہ رہے ہو اور یہ بھی بات غور سے سنو کہ اگر تم شروع سے کھلونوں کی توڑ پھوڑ نہ کرتے تو آج تمہارا بھائی بھی تمہارا کھلونا نہ توڑتا۔ کیوں کہ وہ بھی وہی کام کرے گا جو تم کرو گے۔ چھوٹے بھائی ہمیشہ بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہیں"۔

باپ کی یہ باتیں سن کر سعد کی گردن شرم سے جھک گئی۔ اس کا غصہ اب کافور ہو گیا تھا۔ اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے اب ان کھلونوں کا بھی دکھ ہو رہا تھا جو وہ اس سے پہلے توڑتا رہا تھا۔ باپ نے اسے پیار سے گلے لگا لیا۔ اب وہ اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنے میں اس کی امی بھی آگئیں۔ اس نے اپنے والدین سے معذرت کی اور وعدہ کیا کہ وہ آیندہ کبھی کھلونے نہیں توڑے گا۔ کیوں کہ اسے آج معلوم ہو گیا ہے کہ کھلونے خریدنے کے لیے جو پیسے ادا کرنا پڑتے ہیں وہ کتنی مشکل سے کمائے جاتے ہیں۔

ابو نے اس کی یہ بات سن کر اسے اور زیادہ پیار کیا اور اپنے ساتھ بازار لے گئے تاکہ اسے ویسا ہی ایک نیا جہاز لے کر دیں جیسا اس نے اپنا غلہ توڑ کر خریدا تھا۔

مجرم کون؟

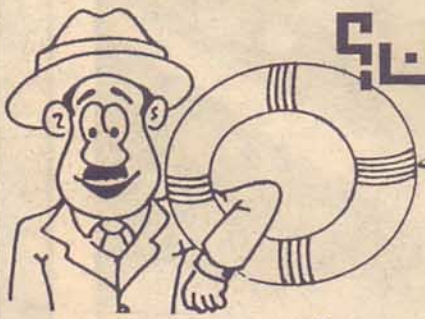

مجرم کا کھوج لگائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 7 مئی 2000ء

مجرم کون؟

نام: _____

پورا پتا: _____

_____

_____

کلب کے سوئمنگ پول میں ایک قتل ہو گیا۔ کلب کا مالک مقتول کا دوست تھا۔ تفتیش کے لیے انسپکٹر زاہد کو بلوایا گیا۔ کلب کے مالک کا کہنا تھا کہ وہ شخص ڈوب کر ہلاک ہوا ہے۔ مگر انسپکٹر زاہد نے جائے واردات کا جائزہ لے کر یہ بات ثابت کر دی کہ مرنے والا ڈوب کر نہیں مرا اور کلب کا مالک جھوٹ بول رہا ہے۔ بتائیے کیسے؟

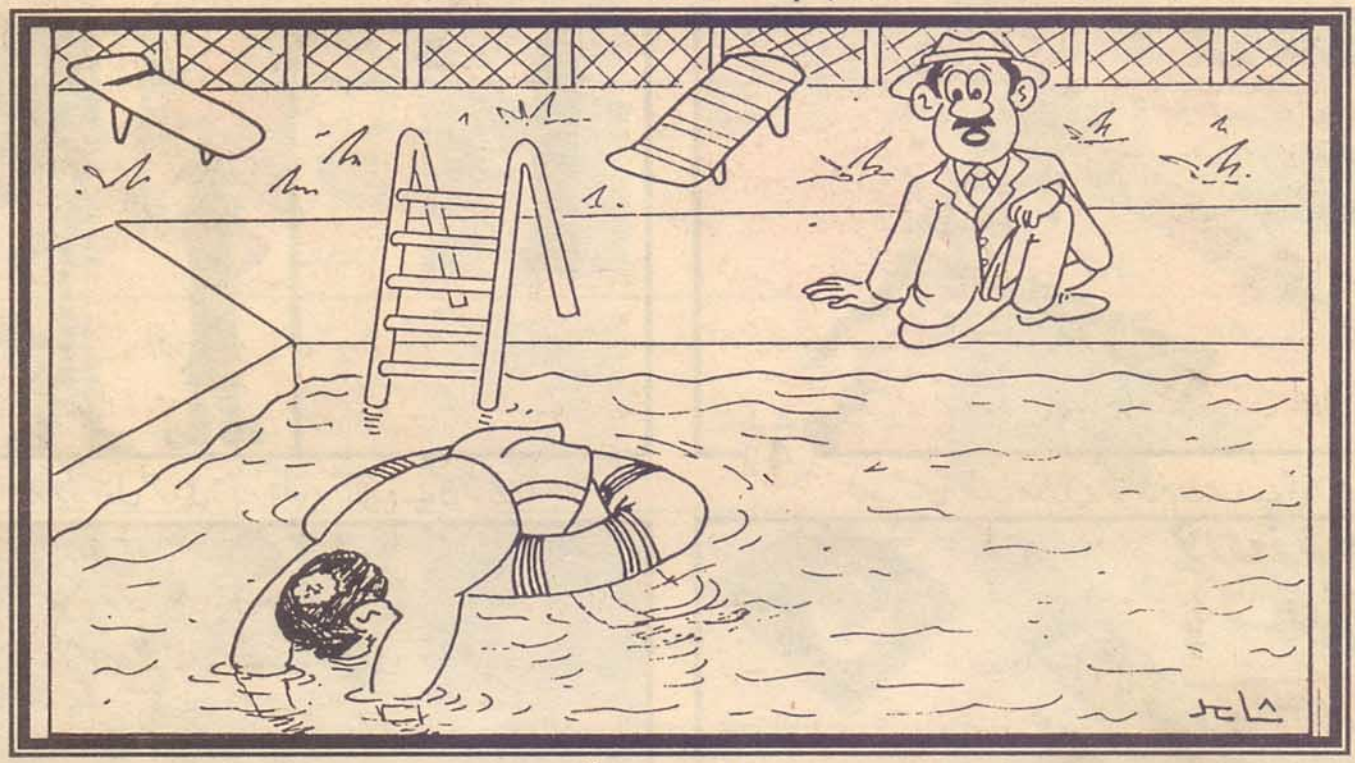

اپریل 2000ء میں شائع ہونے والے ''مجرم کون؟'' کا صحیح حل: جیولر کے ملازم نے بیان دیا کہ میں توہار پکڑا کر لفٹ کے ذریعے چھت پر آ گیا تھا۔ مجھے اس واقعہ کا کچھ علم نہیں۔ حال آں کہ انسپکٹر زاہد نے جائے واردات کا معائنہ کرتے وقت لفٹ کے دروازے پر چسپاں یہ نوٹس پڑھ لیا تھا کہ لفٹ 14 فروری 2000ء سے خراب ہے۔ جب کہ یہ واقعہ 14 اپریل کا تھا۔ اس سے ملازم کا جھوٹ پکڑا گیا اور انسپکٹر زاہد نے اسے مجرم قرار دے دیا۔

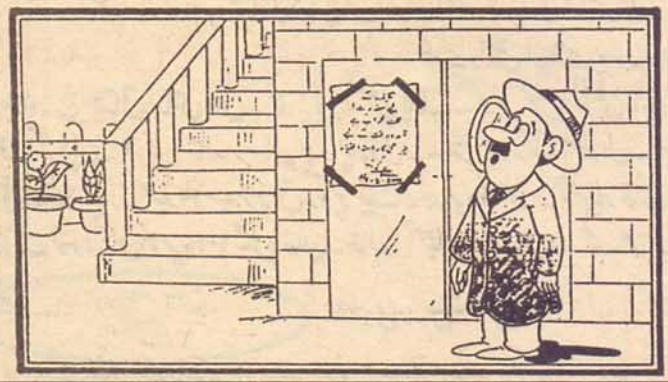

یہ جواب ہمیں 7 اپریل 2000ء تک 4700 ساتھیوں نے ارسال کیا۔ جن میں سے یہ 10 ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار ٹھہرے۔ ان ساتھیوں کو 50، 50 روپے کی کتابیں دی جا رہی ہیں۔ (1) زینب علی کراچی (2) تہنیت نادر اعجاز لاہور (3) ہما فرزین قصور (4) عابد حسین سرگودھا (5) سعدیہ ارم راول پنڈی (6) ندا نواز فیصل آباد (7) محمد فرحان اللہ لاہور (8) انعم جاوید اسلام آباد (9) اسامہ امین ملتان (10) ہاشم الیاس لاہور۔

ہونہار مصور

ایٹمی دھماکا

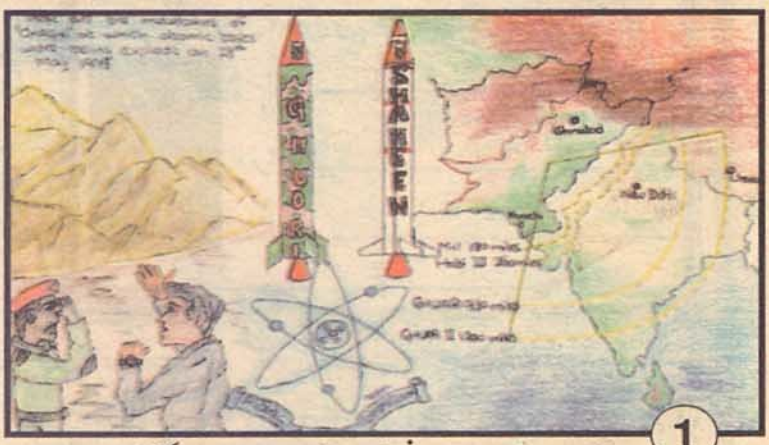

1

ذی شان جاوید، لاہور چھاؤنی (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

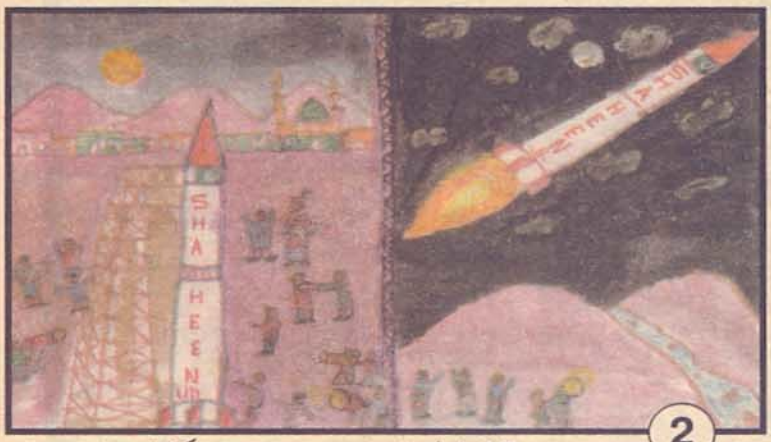

2

عاطف فاروق، بھلوال (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

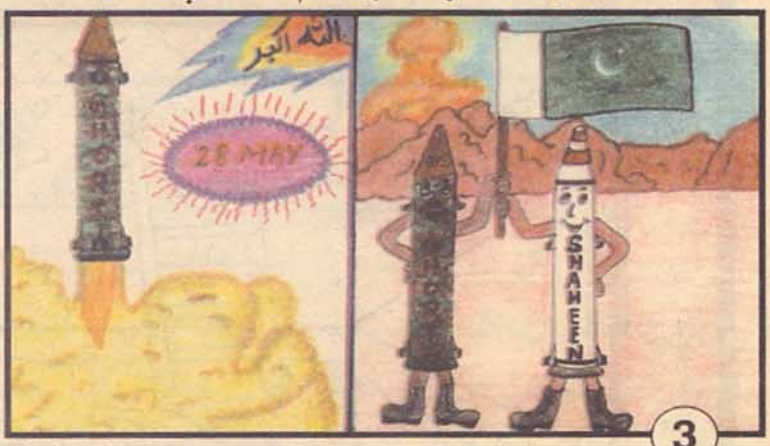

3

جویریہ بتول، کراچی (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

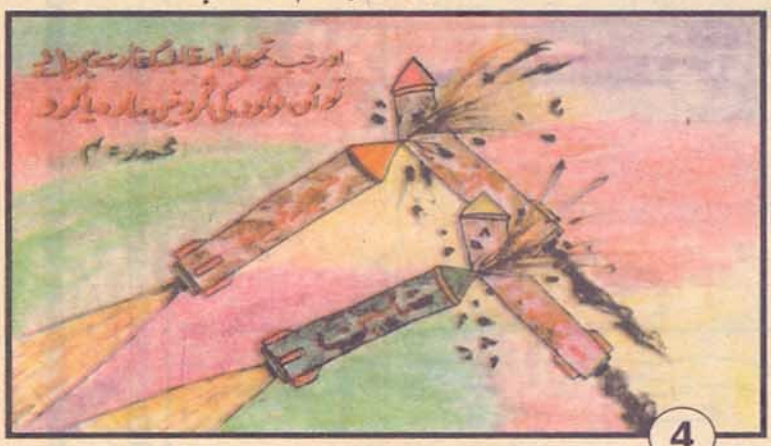

4

شاہد حسین، جھنگ صدر (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

5

انعم باسط، نوشہرہ چھاؤنی (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

6

سعدیہ کنول، نجوال چھاؤنی (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں: طیبہ رفیق لیاقت پور۔ اویس رضا بھلوال۔ شیخ عاطف فاروق بھلوال۔ وقاص حیدر بھلوال۔ عفیفہ سعدیہ فیصل آباد۔ محمد شاہ رخ مشتاق ساہی وال۔ محمد زبیر مغل ٹانک۔ گوہر عزیز فیصل آباد۔ نوشاب علی بنوں۔ عمر شیخ لاہور۔ محمد جنید عالم اسلام آباد۔ اویس احمد جوئیہ ساہی وال۔ ماریہ رؤف کراچی۔ عمران خالد رسال پور چھاؤنی۔ ندیم احمد رضا بھلوال۔ سیدہ نورالعین زاہدی میر پور۔ شارق رفیق خان واہ چھاؤنی۔ صالحہ ناز عبدالرزاق کراچی۔ ندیم باری حافظ آباد۔ عبدالوحید رزاق روپو چک۔ بریرہ فاطمہ رحیم یار خان۔ حافظ محمد عاقب ریاض شور کوٹ چھاؤنی۔ سیما اقبال میر پور۔ اسما اقبال کراچی۔ عبداللہ زبیر لاہور۔ نورالعین ڈیرہ اسماعیل خان۔ خالد حسین کوٹ ادو۔ محمد عزیر مغل ٹانک۔ نثار ٹھور فیصل آباد۔ مزمل حسین اکمل نون روڈہ۔ جاوید خالد راول پنڈی۔

جون کا موضوع: چڑیا گھر کی سیر

آخری تاریخ 7 مئی

جولائی کا موضوع: ریل گاڑی میں سفر

آخری تاریخ 7 جون

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت میں مصور اپنا نام، عمر، کلاس، اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آیئے دوست بنائیں

ندیم خورشید 16سال
کرکٹ
شیر ٹنٹ سروس مین روڈ سخا
کوٹ بازار مالاکنڈ ایجنسی

شہریار خان بابر 11سال
سکے جمع کرنا
62-این3- حیات آباد پشاور

محمد شکیل 15سال
مصوری
نزد پاشا جنرل اسٹور محلہ چوڑی
گراں صلاح الدین روڈ شیخوپورہ

محمد حسن انجم 15سال
مطالعہ
خان زرعی اسٹیل ورکس محلہ شہزاد
نگر ضلع بہاول نگر

محسن اویس نعیم 15سال
کرکٹ
طاہر جمیل منزل نزد مسلم
کمرشل بنک جی ٹی روڈ مرید کے

ثناء اللہ فاروق 13سال
ہاکی
18-بی ماڈل ٹاؤن اے گل برگ
روڈ بہاول پور

عابد علی عابد 15سال
کرکٹ
مکان 418، گلی 3 محبوب
کالونی چشتیاں

محمد عمران فاروق 12سال
سکے جمع کرنا
مسلم میڈیکوز جنڈانوالہ ضلع
بھکر

محمد احمد 16سال
بیڈ منٹن
مکان نمبر 1 محلہ مومن پورہ
شرق پور

عبدالحنان فرید 14سال
کرکٹ
سرفراز کالونی جی ٹی روڈ
گوجرانوالہ

عبدالرحمان حبیب 15سال
کرکٹ
محلہ گلہ خیل بہزاری نکہ
کہوٹ کوہاٹ

عثمان اے خان 14سال
قلمی دوستی
ملتان روڈ چوہنگ لاہور

عثمان غنی 15سال
کمپیوٹر چلانا
مکان 98، یثرب کالونی نزد چوک
یتیم خانہ ملتان روڈ لاہور

عرفان واصف 15سال
ہاکی
مسلم کالونی نزد رینجر گیٹ
بہاول نگر

فیصل شہزاد 17سال
قلمی دوستی
13-اے رحمان پارک عبداللہ پور
فیصل آباد

حارث بن فیض 13سال
کرائے سیکھنا
گلی نمبر 7 جناح پارک رحیم
یار خان

اورنگزیب مروت 16سال
قلمی دوستی
معرفت اعظم دکان دار مقبول آباد
پہاڑپور ڈیرہ اسماعیل خان

محمد زاہد علی 12سال
کرکٹ
گلی نمبر 4 بغداد کالونی رحیم
یار خان

قطب الدین عارف 20سال
معلومات جمع کرنا
فلیٹ 108-107 اے بیلز آرکیڈ
گلزار ہجری مین یونیورسٹی روڈ کراچی

شہروز احمد 10سال
مطالعہ
22 زیڈ، گلی 1 طارق بن زیاد
کالونی ساہی وال

عمران بٹ 18سال
کرکٹ
منگلا ہملٹ ڈاک خانہ منگلا
کالونی میرپور

آیئے دوست بنائیں کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں)

نام ..... عمر .....

مشاغل .....

پتا .....

علی اکمل تصور

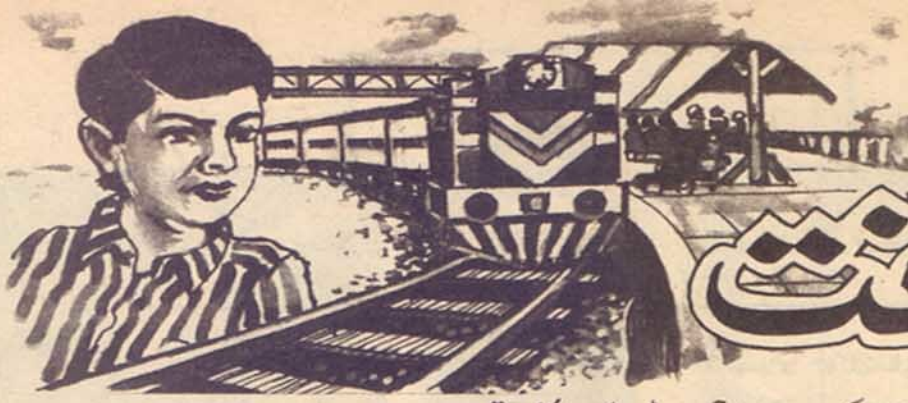

ضمانت

صاحب کے ابو ایک بہت اچھے اسٹوری رائٹر تھے۔ وہ بچوں کے لیے بہت سبق آموز کہانیاں لکھتے تھے۔ حکومت کی طرف سے انہیں بہترین مصنف کا ایوارڈ بھی مل چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک سرکاری ملازم بھی تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں اکثر ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا اور اب دفتر کی طرف سے انہیں کراچی بھیجا جا رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنی فیملی کے ساتھ ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ صاحب کھڑکی کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔

گاڑی رائے ونڈ ریلوے اسٹیشن پر رکی۔ دوسرے ہی لمحے افراتفری کا عالم برپا ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے مارنے لگے۔ اندر کے مسافر گاڑی سے اترنے کی کوشش کر رہے تھے اور نئے مسافر گاڑی میں سوار ہونا چاہتے تھے۔ لیکن قطار نہ بنانے کی وجہ سے سب لوگ چھوٹے سے دروازے میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ ایسے میں صابر علی یہ سارا منظر بہت حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے وہ اپنی امی سے جس بات کی ضد کر رہا تھا اب وہ بات بھی بھول چکا تھا۔

"امی یہاں پر تو سب بڑے لوگ چھوٹے بچے بنے ہوئے ہیں" وہ خوش ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ہمیں تو استاد جی سمجھاتے ہیں لیکن ان لوگوں کو کون سمجھائے گا"۔

"صاحب بیٹے بری بات ہے' یوں نہیں کہتے۔ ان سب لوگوں کو اپنے اپنے گھر جانا ہے اور تم جانتے ہو کہ ریل گاڑی اسٹیشن پر چند منٹوں کے لیے ہی رکتی ہے اس لیے لوگ بے چین ہو جاتے ہے کہ کہیں گاڑی نکل نہ جائے۔ ویسے انسان مصیبت کا شکار اس وقت ہوتا ہے جب وہ بے چین ہو جاتا ہے"۔

"یہی بات تو میں کہہ رہا ہوں امی' بے چینی کے عالم میں ہی انسان پاگلوں جیسی حرکتیں کرتا ہے"۔

صاحب کی بات سن کر امی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ پھر وہ پیار بھرے لہجے میں بولیں۔ "صاحب بیٹے' تم نے یہ بات کہاں سے سنی ہے"

ان کی بات سن کر صاحب مسکرایا اور بولا۔ "ابو جی نے اپنی کہانی میں یہ بات لکھی ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ وہ اتنی اچھی اچھی کہانیاں لکھتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں جانتیں کہ میں وہ سب کہانیاں پڑھتا بھی ہوں۔ ان کی نئی کہانی میں میں نے یہ بات پڑھی تھی"

صاحب کی بات سن کر اس کے ابو مسکرانے لگے۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ مجھے تو حیرت ہو رہی تھی کہ ہمارا بیٹا اتنا سمجھ دار کیسے ہو گیا"

امی کی بات ابھی جاری تھی کہ ریل گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ پٹری پر کھسکنے لگی۔ پلیٹ فارم پر ٹہلنے والے مسافر افراتفری کے عالم میں گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ سفر ایک بار پھر سے شروع ہو چکا تھا اور صاحب کو بھولی ہوئی بات جیسے دوبارہ یاد آ گئی تھی۔

"امی مان جایئے نا' میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں۔ تھوڑا سا گھوم لوں پھر لوٹ آؤں گا"۔

"صاحب بیٹے' تم کیوں نہیں سمجھتے؟ ہم اس وقت سفر کر رہے ہیں۔ یہ تمہارا گھر تو نہیں ہے کہ گلی میں گھوم آؤ گے۔ ہمیں سفر میں احتیاط کرنی چاہیے؟"

"امی میں اس ڈبے میں ہی رہوں گا۔ یہاں سے وہاں تک جاؤں گا اور پھر لوٹ آؤں گا"۔

"تم میں یہ بہت بری عادت ہے' ضد بہت کرتے ہو" امی نے غصے سے کہا۔

ان کی بات سن کر صاحب خاموش ہو گیا۔ اسے خاموش دیکھ کر ابو مسکرائے اور پھر صاحب کی امی جان سے کہا۔ "صاحب بچہ ہی تو ہے اور پھر سفر بہت لمبا ہے۔ اسے

سفر کا لطف لینے دو۔ اور پھر ہم بھی تو موجود ہیں۔ میں اس کا خیال رکھوں گا' اسے ٹہلنے دو" ابو جی کی بات سن کر صاحب خوش ہو گیا۔

"امی میں جاؤں" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا اور پھر امی نے ہاں کے انداز میں سر ہلا دیا۔ صاحب اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر لوہے کے راڈوں کا سہارا لیتے ہوئے خوشی سے آگے بڑھنے لگا۔ مسافر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بہت سے لوگ دل چسپی کے ساتھ کھڑکیوں میں سے باہر دیکھ رہے تھے۔ خدا کی قدرت اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ دور دور تک سر سبز میدان پھیلے ہوئے تھے۔ کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ صاحب جیسے ہر بات کو فراموش کر چکا تھا۔ اس کے ابو بار بار سر گھما کر اس کی طرف دیکھتے تھے اور پھر اطمینان سے اس کی امی کے ساتھ باتوں میں لگ جاتے تھے۔ پھر گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ اگلا اسٹیشن قریب آرہا تھا۔ پھر گاڑی پلیٹ فارم کی حدود میں داخل ہوئی۔ ایک بار پھر سے دھکم پیل کا وہی پرانا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ایسے میں ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ دو مسافر باتیں کر رہے تھے۔

"یہاں پر گاڑی 10 منٹ تک رکے گی میری طرف سے چائے کی دعوت ہے" اس کے بعد وہ دونوں مسافر پلیٹ فارم پر اتر گئے۔ اب صاحب کا دل بھی مچلنے لگا۔ وہ بھی پلیٹ فارم پر اترنا چاہتا تھا۔

پلیٹ فارم پر ٹہلنے میں کیا حرج ہے۔ سب لوگ تفریح کر رہے ہیں۔ جب وہ سوار ہوں گے تو میں بھی سوار ہو جاؤں گا" اس نے جیسے اپنے دل میں ہی فیصلہ کر لیا اور پھر پلیٹ فارم پر اتر آیا لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر فولادی جنگلے کے ساتھ ہی پانی کا نل لگا ہوا تھا۔ لوگ اپنے چلو میں پانی بھر کر پی رہے تھے۔ پانی دیکھ کر اسے بھی پیاس محسوس ہونے لگی۔ وہ تیزی سے پانی کی طرف بڑھا اور پھر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی باری آئی اور اس نے اپنے چلو میں پانی بھرا لیکن پھر پانی کا گھونٹ اس کے گلے میں ہی اٹک کر رہ گیا۔ ریل گاڑی پٹری پر کھسک رہی تھی۔ غم کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ تیزی سے اٹھا اور پھر لپک کر گاڑی کی طرف بڑھا لیکن دوسرے مسافروں نے اس کا راستہ روک لیا۔

"مجھے جانے دو' مجھے گاڑی میں سوار ہونا ہے" وہ چیخ رہا تھا لیکن دوسرے مسافروں کے شور میں اس کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ گاڑی کی رفتار تیز ہو رہی تھی اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے موجود منظر لہرا کر رہ گیا۔ اسے ٹھوکر لگی تھی۔ سہارا لینے کے لیے اس نے ایک مسافر کی قمیص کا کونا تھام لیا لیکن دوسرے ہی لمحے چرڑ کی آواز کے ساتھ قمیص کا وہ کونا ایک چیتھڑے کی صورت میں اس کے ہاتھوں میں آگیا۔ اس مسافر نے گھور کر صاحب کی طرف دیکھا لیکن کچھ کہنے سننے کا وقت نہیں تھا۔ صاحب پلیٹ فارم پر اوندھے منہ گرا تھا۔ لیکن وہ درد کی پروا کیے بغیر اٹھا اور پھر گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ وہ اسی ڈبے میں سوار ہونا چاہتا تھا جس میں اس کی امی اور ابو موجود تھے۔ گاڑی کی رفتار خاصی تیز ہو چکی تھی اور پھر گاڑی کا آخری ڈبا بھی آگے نکل گیا۔ اب صاحب پلیٹ فارم پر کھڑا ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔

"امی....امی....اب میں کہاں جاؤں؟ امی مجھے اپنے ساتھ لے جایئے" اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو رخساروں پر لڑھک رہے تھے۔ اس کی چھوٹی سی ضد اور ذرا سی بے احتیاطی اسے ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا کر گئی تھی۔

"اب کیا ہو گا؟" ایک خوف ناک سوال اس کے ذہن میں رقص کر رہا تھا۔ پھر جیسے اس کے بے قرار دل کو قرار آگیا۔ اسے اپنے ابو کی لکھی ہوئی ایک کہانی یاد آگئی۔ اس

کہانی میں ایک بچہ اپنے والدین سے بچھڑ جاتا ہے اور پھر وہ بھٹکتے بھٹکتے پولیس اسٹیشن پہنچ جاتا ہے۔ اس کی گم شدگی کی خبر پولیس اسٹیشن میں موجود ہوتی ہے۔ اس طرح مہربان پولیس والے اسے اس کے والدین تک پہنچا دیتے ہیں۔

"مجھے بھی پولیس اسٹیشن جانا چاہیے" یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے اپنی آنکھوں میں موجود آنسو صاف کیے اور پھر ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ اب اس نے ایک راہ چلتے آدمی کو روک لیا۔

"انکل، مجھے پولیس اسٹیشن جانا ہے"

صاحب کی بات سن کر وہ آدمی چونکا اور پھر تیزی سے بولا۔ "پولیس اسٹیشن تو نزدیک ہے لیکن مجھے جلدی ہے کسی اور آدمی سے پوچھ لو" اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور صاحب حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا پھر بولا۔

"عجیب بات ہے کسی بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھانا بھی نیکی ہے لیکن لوگ یہ نیکی حاصل کرنا ہی نہیں چاہتے" پھر وہ کسی مناسب آدمی کی تلاش میں دوبارہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سامنے ایک آدمی چلا آرہا تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ قمیص کے اوپر کوٹ بھی موجود تھا۔ وہ آدمی صاحب کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

"صاحب زادے خیریت تو ہے...." اس کی آواز میں بہت مٹھاس تھی۔ صاحب کی جھجک فوراً ہی دور ہو گئی۔

"انکل، مجھے پولیس اسٹیشن جانا ہے"۔

پولیس اسٹیشن کا سن کر وہ آدمی بھی چونک اٹھا۔ "برخوردار، خیریت تو ہے، تم پولیس اسٹیشن کیوں جانا چاہتے ہو؟"

"وہ بات یہ ہے کہ میں اپنے والدین کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ پھر اپنی بے وقوفی کی وجہ سے میں اسٹیشن پر ہی رہ گیا اور گاڑی نکل گئی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ پولیس اسٹیشن چلا جاؤں۔ پولیس ہی مجھے میرے والدین تک پہنچائے گی" اپنی بات کہنے کے ساتھ ہی صاحب اداس ہو گیا۔

"تم ایک سمجھ دار اور باہمت لڑکے ہو، چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں"

اس آدمی کی بات سن کر صاحب خوش ہو گیا۔ مصیبت میں اسے سہارا مل چکا تھا۔ پھر اس آدمی نے ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی والے کو بلایا اور پھر ڈرائیور کو کسی جگہ کا نام بتا دیا۔ ٹیکسی چل پڑی تو صاحب نے کہا۔

"انکل، پولیس اسٹیشن تو قریب ہے پھر آپ نے ٹیکسی کیوں لی؟"

صاحب کی بات سن کر وہ آدمی گڑ بڑا گیا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ "بیٹے اگر گلیوں میں سے گزر کر جایا جائے تو قریب ہے۔ لیکن گلیوں والا راستہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ اس لیے سڑک کے راستے چلتے ہیں"

اس کی بات سن کر صاحب مطمئن ہو گیا۔ 15 منٹ کے سفر کے بعد ٹیکسی رک گئی۔ اس آدمی نے کرایہ ادا کیا۔ صاحب اسے عقیدت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ خدا کا شکر ادا کر رہا تھا جو اسے ایسا مہربان مل گیا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ ہم اپنی منزل کے بہت قریب ہیں" اس آدمی نے نرمی سے کہا اور پھر وہ دونوں سڑک عبور کر کے گلی میں چلے آئے۔

"ابھی اور کتنا چلنا پڑے گا؟" صاحب بہت بے قرار تھا۔

"بیٹے حوصلہ رکھو، ہم تھوڑی دیر میں وزیر علی کے سامنے موجود ہوں گے"۔

"یہ وزیر علی کون ہے؟" صاحب چونک پڑا۔

وہ آدمی مسکرایا اور بولا "وزیر علی انسپکٹر کا نام ہے۔ وہ میرا دوست ہے"۔

"اچھا تو یہ بات ہے" صاحب مطمئن ہو گیا اور پھر اس آدمی کے اٹھتے قدم رک گئے۔ صاحب بھی رک گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک کھنڈر نما مکان موجود تھا۔ وہ آدمی مکان کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"یہ میرا گھر ہے۔ میں اپنی بیوی کو بتا آؤں کہ آج

گھر تاخیر سے پہنچوں گا۔ تم رکو میں ابھی آتا ہوں"

اس کی بات سن کر صاحب نے سر ہلا دیا۔ وہ آدمی دروازے کے درمیان میں پہنچ کر دوبارہ رک گیا۔

"بیٹے تم بھی آہی جاؤ۔ باہر کھڑے رہو گے تو اچھا نہیں لگے گا"

صاحب اس کی بات سن کر مسکرایا اور پھر اس کے پیچھے گھر میں داخل ہو گیا۔ لیکن دوسرا لمحہ قیامت جیسا تھا۔ اس نے صاحب کو چڑیا کے بچے کی مانند دبوچ لیا۔

"چھوڑو مجھے، چھوڑ دو مجھے" وہ پوری طاقت سے چلایا۔

"بچے، تم کو چھوڑنا ہوتا تو یہاں تک لانے کا کیا مطلب تھا؟"

وہ صاحب کو گھسیٹتا ہوا کمرے میں لایا اور پھر اسے فرش پر پٹخ دیا۔ صاحب سہم چکا تھا اور پھر وہ ایک کونے میں سمٹ گیا۔ اب وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں اس ادھیڑ عمر آدمی کے علاوہ ایک آدمی اور بھی موجود تھا۔ ان دونوں کے علاوہ چند لڑکے بھی ایک طرف چٹائی پر بیٹھے تھے۔

"نواز یار آج بہت دنوں کے بعد آنا ہوا" کمرے میں موجود اجنبی آدمی مسکراتے ہوئے بولا۔

"وزیر علی کیا بتاؤں، اچھا شکار بہت مشکل سے ملتا ہے۔ لیکن آج جو لڑکا لایا ہوں تمہارے لیے بہت کام کا ثابت ہو گا۔ یہ بہت ذہین ہے۔ اگر یہ تمہارا ہنر سیکھ لے تو یقین مانو ایک دن آئے گا جب یہ تمہیں سونے کی کرسی پر بٹھائے گا"۔

"مستقبل کی بات مت کرو نواز، ابھی بتاؤ تمہیں کیا چاہیے؟"

"وزیر علی تم آنکھوں والے ہو، ہیرے اور پتھر میں فرق جانتے ہو۔ پہلے جو لڑکے لایا ہوں ان سے قیمت زیادہ ملے تو تمہیں جوہری مانوں گا" اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ موجود تھی۔

"تم ایک بہت خبیث آدمی ہو لیکن خیر" وزیر علی نے بات ادھوری چھوڑ دی اور پھر صاحب کے پاس چلا آیا اور اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ صاحب بہت خوف زدہ تھا۔ وہ مزید سمٹ گیا۔

"ڈرو مت لڑکے، میں تم پر مہربان رہوں گا" وزیر علی سنجیدگی سے بولا اور صاحب کے ہاتھوں کا جائزہ لینے لگا۔ صاحب کی انگلیاں لمبی اور ستواں تھیں۔ وزیر علی کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔

"نواز، تم درست کہتے ہو۔

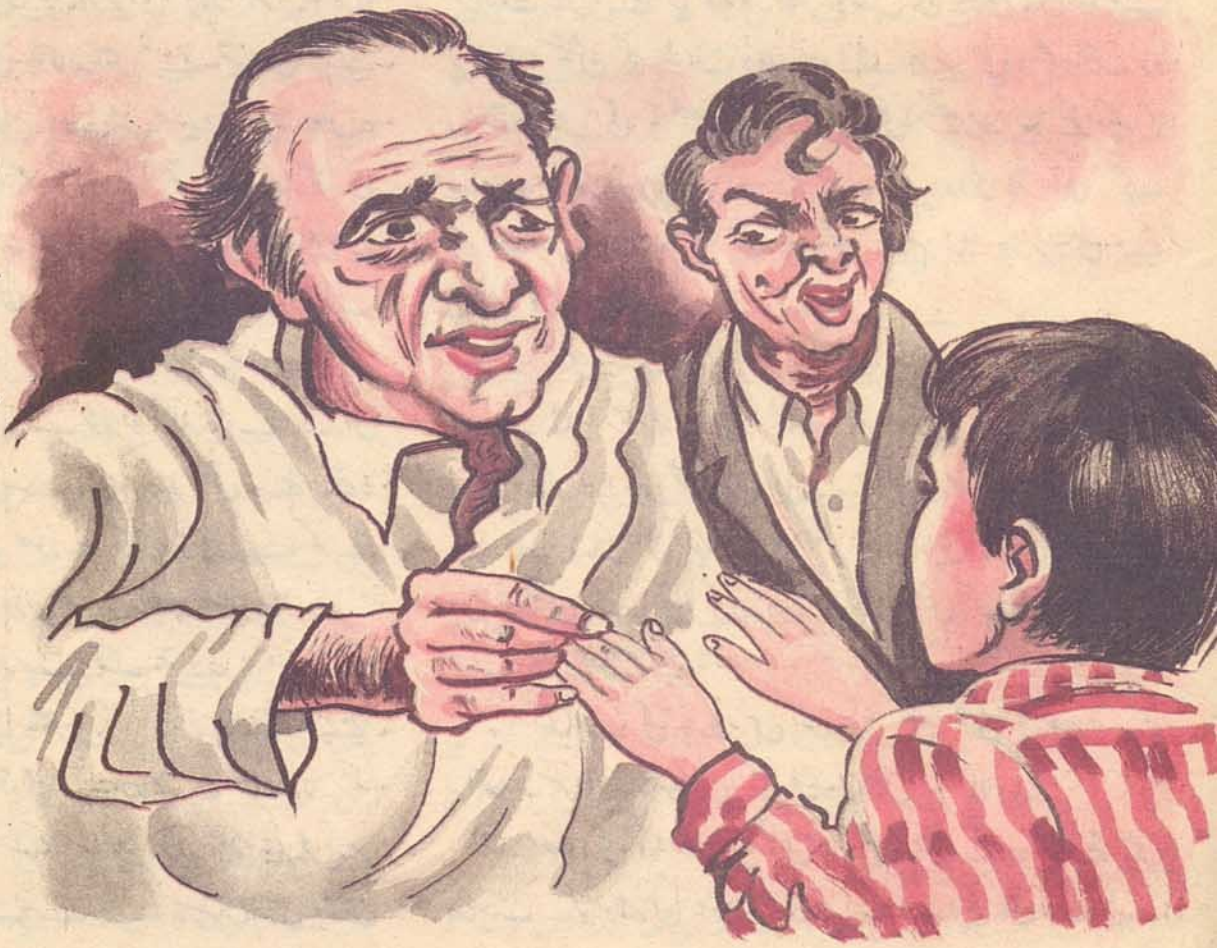

لڑکے میں بات ہے" اتنا کہہ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر 5 ہزار روپے نکال کر نواز کی طرف بڑھا دیئے۔ نواز نے رقم دبوچی اور پھر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

"لے لڑکے' یہ ہے وزیر علی انسپکٹر صاحب۔ اب انہیں اپنی کہانی سناتے رہنا' میں تو چلتا ہوں" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ وزیر علی اب بہت غور سے صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا اور صاحب سہمی سہمی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وزیر علی کی آنکھیں سبز تھیں۔ دیکھنے میں وہ ایک دیہاتی آدمی نظر آتا تھا۔ پھر وہ پیار سے بولا۔

"میرا نام تو تم جان چکے ہو اب تم بتاؤ کہ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

"مم ....میں میرا نام صابر علی ہے۔ پیار سے سب مجھے صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ میں ....مجھے اپنے والدین کے پاس جانا ہے۔ مجھے جانے دو۔

صاحب کی بات سن کر وزیر علی چند لمحوں تک خاموش رہا پھر سخت لہجے میں بولا۔"میں نے تمہاری قیمت دی ہے۔ اب تم میرے غلام ہو۔ میں جیب کترا ہوں۔ تمہیں بھی یہی ہنر سکھاؤں گا لیکن اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی یا پھر میری بات نہ مانی تو تمہارے ہاتھ پیر توڑ کر تمہیں کسی چوراہے پر ڈلوا دوں گا۔ پھر تم سے بھیک منگواؤں گا"

اس کی بات سن کر صاحب زار و قطار رونے لگا۔"امی جی ....ابو جی...." اس کے منہ سے یہی الفاظ نکل رہے تھے۔ پھر وہ چونک پڑا۔ ایک بزرگ صورت آدمی تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر وزیر علی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا خبر ہے بابا جی ....سب ٹھیک تو ہے نا"

اچانک ہی وہ بہت بے چین نظر آنے لگا تھا۔ "بیٹے' خدا کو یہی منظور تھا" بزرگ آدمی نے نرمی سے کہا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا؟" وہ چیخ پڑا۔"میری ماں مر نہیں سکتی۔ میں نے اسے سب سے بڑے ہسپتال میں داخل کرا رکھا تھا۔ وہ مر نہیں سکتی۔ ڈاکٹروں کو سمجھ نہیں آئی ہو گی۔ وہ سو رہی ہو گی"

وزیر علی کا ایک نیا روپ صاحب کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ اسے وزیر علی کے چہرے میں اپنا چہرہ نظر آرہا تھا۔ وہ بھی تو اپنی ماں کے لیے ہی بے قرار تھا۔

"بیٹے' صبر کرو۔ خدا کی رضا میں شاکر رہنا چاہیے لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تمہاری ماں کو تمہارے گناہوں کی سزا ملی ہے۔ مظلوم بچوں اور ان کے وارثوں کی بددعائیں تمہارا پیچھا کرتی ہیں۔ یہ ظلم والا کام چھوڑ دو۔ تمہاری ماں کی بھی یہی خواہش تھی"۔

بزرگ آدمی کی بات ابھی جاری تھی کہ بھاری بوٹوں کی آواز فضا میں گونجی اور پھر دروازے پر ایک زور کا دھکا لگا۔ اس کے ساتھ ہی صاحب خوشی سے چیخ اٹھا۔ خدا کی طرف سے مدد آپہنچی تھی۔ پولیس نے وزیر علی کو اپنی حراست میں لے لیا تھا اور پھر پولیس کی گاڑی میں وہ سب پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ وزیر علی ابھی تک رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ پڑ چکی تھیں۔ جانے کیوں صاحب کے دل میں اس کے لیے ہم دردی اتر آئی تھی۔ پھر صاحب نے وزیر علی کا ہاتھ تھام لیا۔ وزیر علی نے چونک کر صاحب کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کے غم کو سمجھ سکتا ہوں۔ آپ بڑے ہیں اور میں چھوٹا ہوں۔ لیکن ہم دونوں نے ہی ماں کی جدائی کے درد کو محسوس کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے میری ماں مل جائے گی مگر آپ اپنی ماں کو کھو چکے ہیں۔ لیکن آپ ان کی روح کو تو راضی کر سکتے ہیں۔ یہ خراب کام چھوڑ دیجیے"

صاحب کی بات سن کر وزیر علی بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرایا اور پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جلد ہی وہ سب پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ تھانے میں صاحب کے والدین موجود تھے۔ صاحب اپنی امی سے لپٹ

گیا۔ وہ دونوں رو رہے تھے۔ اس کے ابو آنکھوں میں نمی لیے مسکرا رہے تھے۔ پھر وزیر علی زور سے چیخا۔

"مجھے جانے دو' تم لوگ مجھے روک نہیں سکتے۔ میری ماں مر چکی ہے۔ ابھی مجھے اس کے کفن دفن کا انتظام بھی کرنا ہے"۔

اس کی بات سن کر انسپکٹر سنجیدگی سے بولا۔ "ہم نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ اگر ہمارا مخبر ہمیں خبر نہ دیتا تو تم نے ایک مظلوم لڑکے کو بھی مجرم بنا ڈالنا تھا۔ وہ تو اللہ نے ان کی مدد فرمائی جو یہ چلتی گاڑی کو رکوا کر پولیس اسٹیشن چلے آئے اور ہم وقت پر یہ سارا آپریشن مکمل کرنے میں کام یاب ہو پائے۔ تم مجرم ہو اور تمہیں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا ہو گی"۔

"میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں لیکن ابھی مجھے جانے کی اجازت دیجیے۔ میری ماں کی لاش ہسپتال میں لاوارث پڑی ہو گی۔ مجھے تھوڑی مہلت دیجیے۔ پھر میں لوٹ آؤں گا۔ میں ضرور لوٹ آؤں گا" وہ تیز لہجے میں بولا۔

اس کی بات سن کر انسپکٹر مسکرایا اور بولا۔ "تم اور لوٹ آؤ گے۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔ اگر مجرموں میں ضمیر موجود ہوتا تو پولیس کے محکمے کی ضرورت نہ ہوتی" پھر اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "اسے حوالات میں بند کر دو"

سپاہیوں نے وزیر علی کو دبوچ لیا۔ اب وہ چیخ رہا تھا' چلا رہا تھا لیکن اس کی بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسے میں صاحب زور سے بولا۔

"انسپکٹر صاحب' اسے جانے دیجیے۔ اس کی ماں فوت ہو چکی ہے"

صاحب کی بات سن کر سب حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"بیٹے' تم ابھی چھوٹے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ یہ مجرم ہے اور اسی نے تمہیں قید کر رکھا تھا۔ تمہیں تو اس سے نفرت ہونی چاہیے"۔

"افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہاں کوئی اس بات کو سمجھ نہیں رہا کہ یہ مجرم ہوتے ہوئے بھی ایک بیٹا ہے جس طرح میں ایک بیٹا ہوں اور ماں سے جدائی کے درد کو میں محسوس کر سکتا ہوں"۔

انسپکٹر نے چند لمحوں تک کچھ سوچا اور پھر بولا۔ "میں سرکاری ملازم ہوں۔ ہمارے اپنے کچھ ضابطے ہیں۔ میں اسے ایک صورت میں چھوڑ سکتا ہوں' اگر کوئی اس کی ضمانت دے ورنہ نہیں۔ اور یہاں اس کی ضمانت کوئی نہیں دے گا"۔

اتنا کہہ کر انسپکٹر دوبارہ اپنے ماتحتوں کی طرف پلٹا اور بولا۔ "اسے حوالات میں بند کر دو"

اس کی بات سن کر صاحب چیخ اٹھا۔ "رک جاؤ۔ میں اس کی ضمانت دوں گا"

پھر وزیر علی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جس لڑکے کو وہ جیب کترا اور بھکاری بنانا چاہتا تھا وہی اس کی ضمانت دے رہا تھا۔ اپنے اور اس کے درمیان فرق محسوس کر کے وزیر علی کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔ ایسے میں اس کے کانوں سے انسپکٹر صاحب کی آواز ٹکرائی۔ "وزیر علی' تم جا سکتے ہو۔ اس لڑکے کا والد تمہاری ضمانت دینے کے لیے تیار ہے"

انسپکٹر کی بات سن کر سپاہیوں نے اسے چھوڑ دیا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور صاحب کے ہاتھ تھام لیے۔ "تم بہت اچھے ہو' شکریہ" اتنا کہہ کر وہ پلٹا مگر پھر لوٹ آیا۔

"انسپکٹر صاحب ذرا کاغذ اور قلم دیجیے"

اب وزیر علی کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔ سب لوگ تجسس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر وزیر علی نے کاغذ انسپکٹر کی طرف بڑھایا اور بولا۔ "انسپکٹر صاحب، اس لڑکے کے ایثار نے مجھے مجرم سے انسان بنایا ہے۔ اس کاغذ پر میں نے اس آدمی کا پتا لکھ دیا ہے جو اسے میرے پاس بیچ گیا تھا۔ آپ اسے بھی گرفتار کر لیجیے" اتنا کہہ کر وزیر علی کمرے میں سے باہر نکل گیا۔ سب لوگ حیرت سے اسے جاتا دیکھ رہے تھے۔ آج ایک مجرم نے انسان بنتے ہی اس نے انسانیت کا حق ادا کر دیا تھا۔

صادقین

پیدائش
جون 1930

وفات
فروری 1987

سید شوکت اعجاز

عالمی شہرت کے مالک نام ور مصور، خطاط اور شاعر صادقین جون 1930ء میں امروہہ (ہند) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے فن کی ابتدا بچپن سے ہی اسکول کی کتابوں، کاپیوں پر پنسلوں اور دیواروں پر کوئلے کے نقوش بنانے سے کی۔ 1948ء میں آگرہ یونی ورسٹی سے گریجویشن کی۔ کچھ عرصہ تک آگرہ میں مختلف اسکولوں میں مصوری کی تعلیم دیتے رہے۔ 1956ء میں پاکستان آگئے یہاں کچھ عرصہ تک ریڈیو پاکستان میں بطور پروگرام اسسٹنٹ کام کرتے رہے لیکن مصوری کے شعبے میں ان کی خداداد صلاحیتیں رنگ لائیں اور بہت جلد اپنے منفرد خطاطی اور مصوری کے انداز سے شہرت حاصل کرلی۔ لیکن عالمی شہرت انہوں نے بڑے بڑے میورلز MURALS (دیواری تصویریں) بنا کر پائی ان کی زندگی کی پہلی باقاعدہ تصویری نمائش 1954ء میں کوئٹہ میں ہوئی۔ اس کے بعد 1955ء میں کراچی میں ان کی ایک نمائش ہوئی۔ ان کی پہلی بڑی دیواری تصویر کراچی کے ہوائی اڈے کے لیے مصور ہوئی تھی۔ جس کو بے پناہ شہرت ملی۔ ان کے اس کام کو سراہتے ہوئے بڑے بڑے اداروں نے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے دیواری تصاویر مصور کریں۔ اس طرح انہوں نے کسٹم کلب اور سروسز کلب کی دیواروں پر مصوری کی۔ 1961ء میں انہوں نے سٹیٹ بنک آف پاکستان کراچی کی لائبریری میں ایک عظیم الشان دیواری تصویر بنائی جس کو انہوں نے وقت کے خزانے کا نام دیا۔ اس دیواری تصویر میں انہوں نے سقراط سے آئن سٹائن تک ہر زمانے کی علمی اور سائنسی ترقی کو بڑے خوب صورت انداز سے مصورانہ رنگ دیا۔ لیکن دیواری تصویروں میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ منگلا ڈیم کے بجلی گھر کی میورل ہے۔ یہ میورل 25X175 فٹ سائز کی ہے۔ اس بے مثال تصویر میں انہوں نے محنت کی عظمت کو مصورانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

صادقین نے 1970ء سے مصورانہ خطاطی کا کام شروع کیا اور قرآن پاک کی آیات کو اپنے مخصوص اور منفرد

اسلامی سربراہی کانفرنس (1974ء) منعقدہ لاہور کے لیے صادقین کی مصوری کا نمونہ

انداز سے مصور کیا۔ اس فن میں ان کا بہترین نمونہ سورۃ رحمٰن کی خطاطی ہے۔ جس کی آیات مبارکہ اس طرح مصور کی گئی کہ ہر آیت اپنے معنی کی تصویر بن گئی۔ اس طرح انہوں نے مصورانہ خطاطی میں نئے اسلوب اور ڈھنگ کی بنیاد رکھی۔ 1972ء میں سورۃ یٰسین کو 260 فٹ طویل پینل پر تحریر کیا۔ 1973ء میں لاہور کے عجائب گھر کی چھت کو بھی بے مثال اور دل کش مصورانہ رنگ دیا۔ پنجاب پبلک لائبریری میں قرآنی آیات کو دلکش خطاطی سے مصور کیا۔

صادقین نے کئی عالمی نمائشوں میں انعامات اور اعزازات حاصل کئے۔ ان کی مصوری کی نمائش فرانس کے علاوہ لندن اور واشنگٹن (امریکا) میں بھی ہوئی۔ 1974ء میں انہوں نے مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا جن میں سعودی عرب، عرب امارات شام، اردن، کویت اور عراق شامل ہیں۔ اس کے بعد وہ مصر بھی تشریف لے گئے۔ 1975ء میں انہوں نے آسٹریلیا میں اپنی تصاویر کی نمائش کی۔ بعد میں اسی سال انہوں نے رومانیہ اور روس کا دورہ بھی کیا اور سال کے اواخر میں انقرہ (ترکی) اور تہران (ایران) بھی گئے اور وہاں تصویری نمائش منعقد کی۔ اس طرح ان کو بے پناہ عالمی شہرت حاصل ہوئی اور وہ مصوری کے شعبے میں پاکستان کی پہچان بن گئے۔

1981-82ء میں صادقین بھارت گئے۔ جہاں ان کے کام کو بے حد سراہا گیا۔ دہلی میں ان کے فن پاروں کی نمائش ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے لیے انہوں نے دیواری تصویر مصور کی۔ انہوں نے علی گڑھ، حیدر آباد دکن اور بنارس میں اپنے فن کے نقوش مصور کئے۔ ادارہ معارف اسلامیہ میں انہوں نے ''اسمائے حسنہ'' مصور کئے۔

صادقین فن خطاطی اور فن مصوری کے ساتھ ساتھ شاعری کا بے پناہ ذوق رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ 1970ء میں رباعیات صادقین کے عنوان سے رباعیات کا مجموعہ شائع ہوا۔ ان رباعیات کو انہوں نے مصورانہ رنگ بھی دیا۔ صادقین کی صلاحیتوں کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انہیں کئی قومی اعزازات سے نوازا۔ پہلے انہیں تمغہ امتیاز دیا گیا۔ پھر 1962 میں تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا گیا اور پھر 1980ء میں ستارہ امتیاز دیا گیا۔

1986ء میں صادقین نے کراچی کے جناح ہال کو مصوری سے آراستہ کرنا شروع کیا۔ یہ ان کا آخری بڑا کام تھا جو پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور وہ 10 فروری 1987ء کو انتقال فرما گئے۔

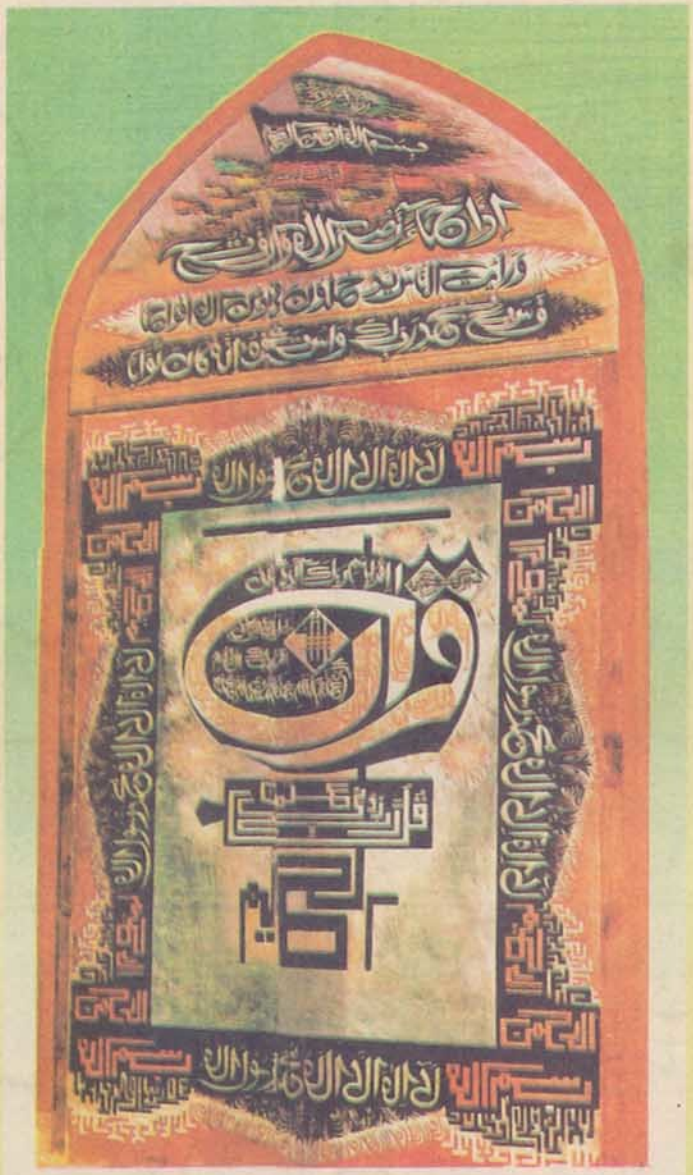

صادقین کی قرآنی خطاطی کا نمونہ

کارٹون کہانی

گنجو میاں نے گولا پھینکا

شاہد ریاض شاہد

ایک دن گنجو میاں گولا پھینکنے کا مظاہرہ دیکھنے گئے وہاں ایک آدمی لوہے کا گولا گھما رہا تھا۔

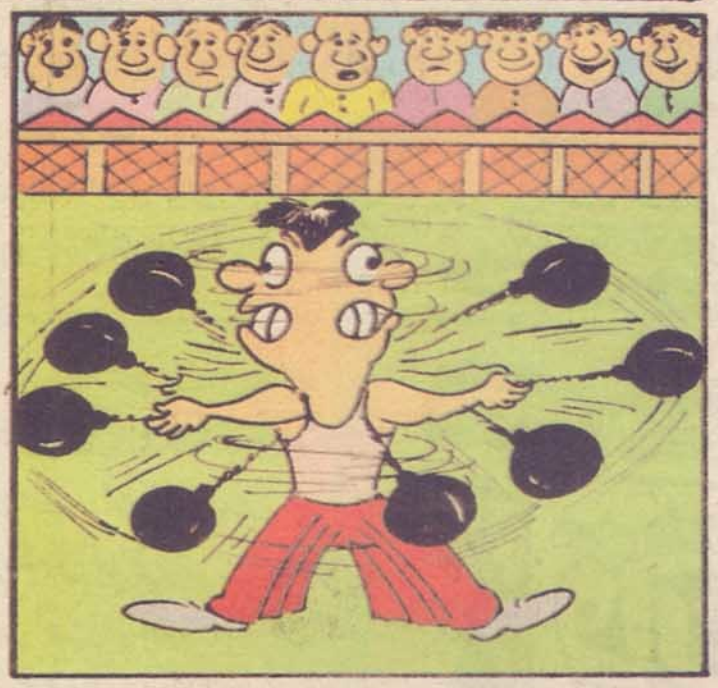

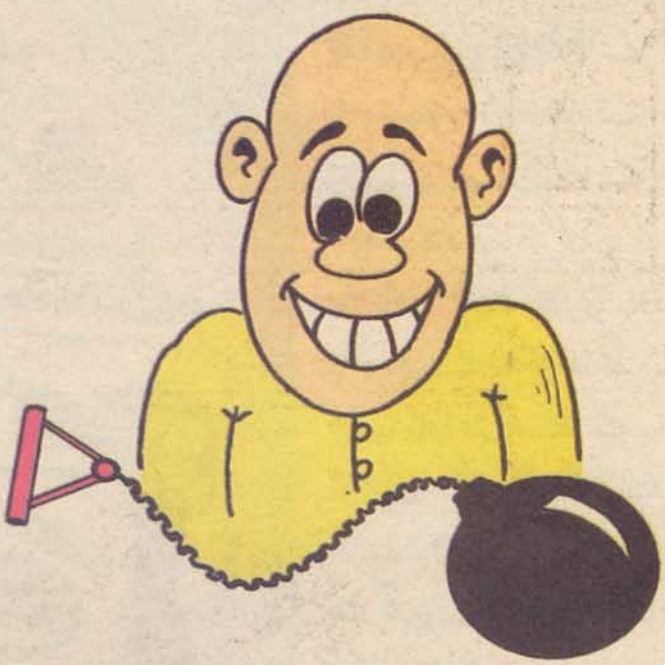

اس نے جب گولا ہوا میں پھینکا تو وہ لوگوں کے سروں سے ہوتا ہوا میدان سے باہر جا گرا

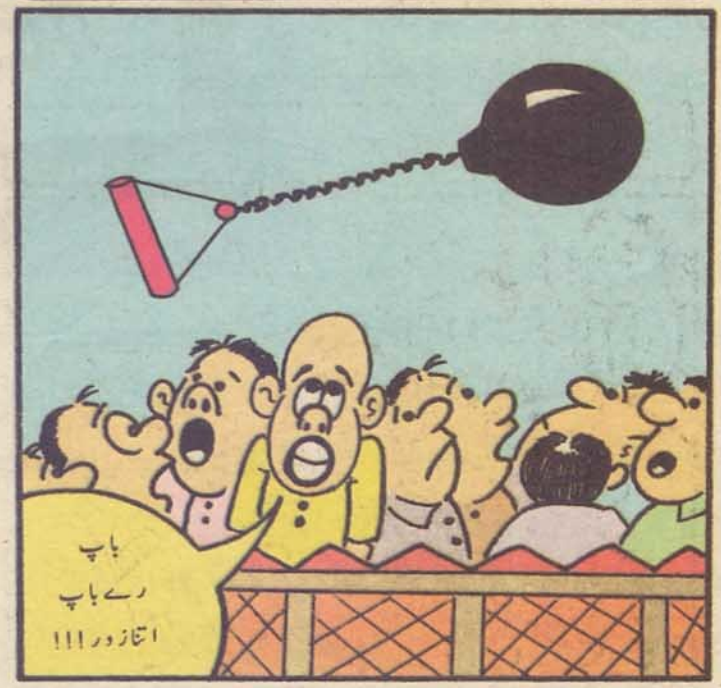

پھر اس آدمی نے پورے مجمعے کو چیلنج کیا مگر کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اس کی بات کا جواب دے سکے

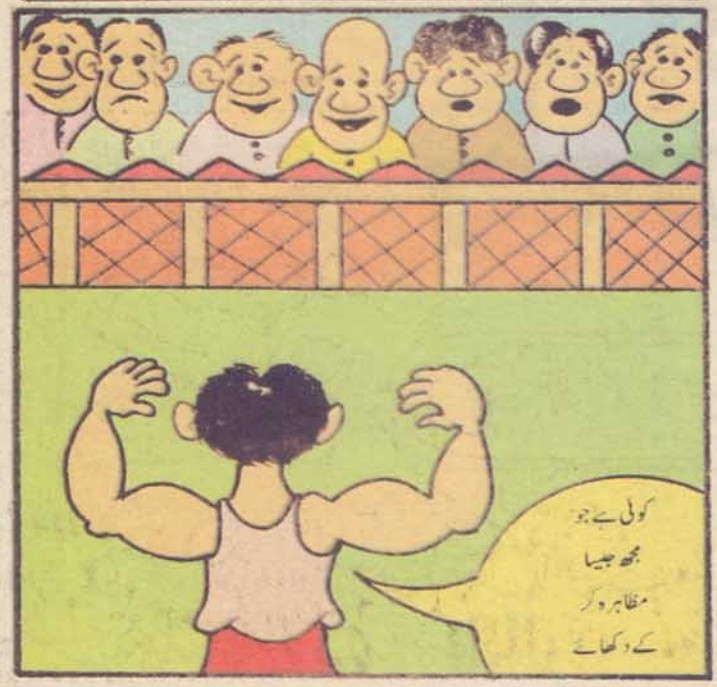

مگر نہ جانے گنجو میاں کو کیا ہوا۔ انہوں نے چیلنج قبول کر لیا

گنجو میاں کے دوستوں نے ان کو بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے

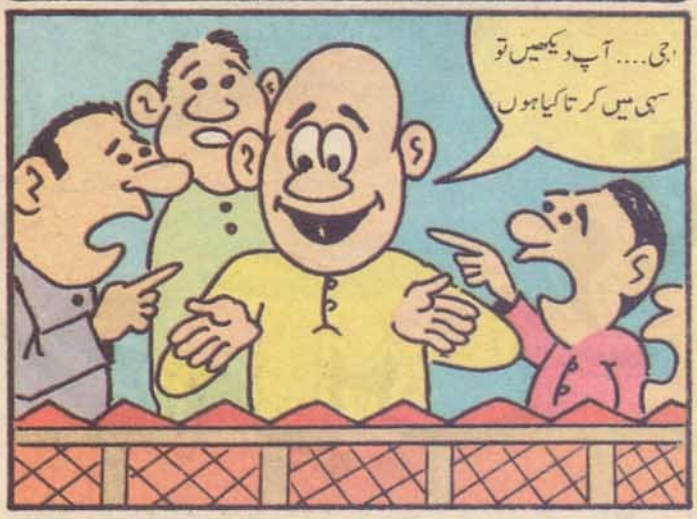

پھر گنجو میاں میدان میں اترے اور گولا گھمانا شروع کر دیا

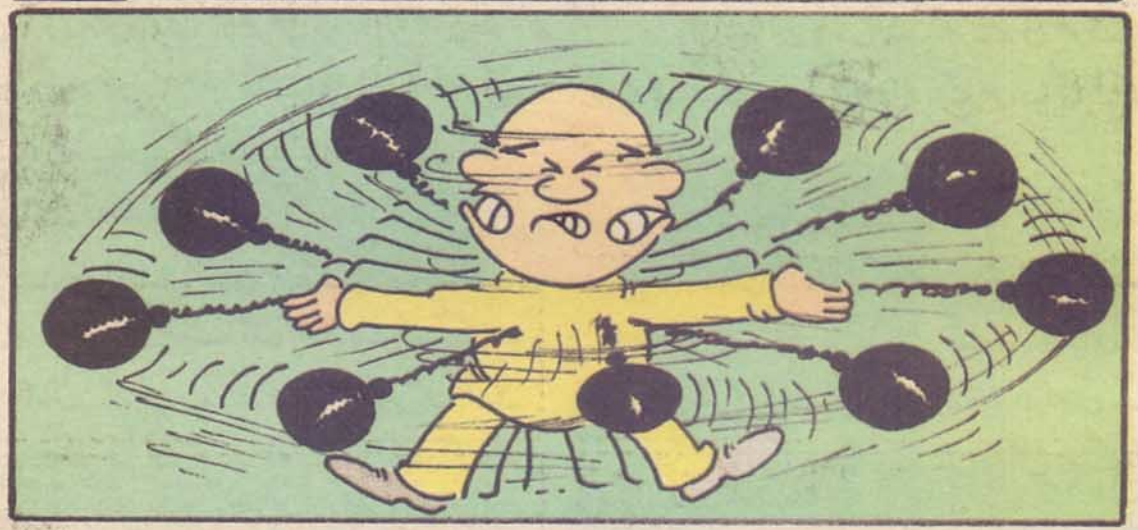

مگر جب گنجو نے گولا گھما کر پھینکا تو وہ گولے کے بجائے خود اسٹیڈیم سے باہر جا گرے

پھر کیا تھا، گنجو میاں تھے اور ان کی ہائے ہائے تھی

سلسلہ وار

قسط نمبر 1

راہ میں دشمن

"شی.... مم.... میں نے گھر میں تین سائے داخل ہوتے دیکھے ہیں، نعمان.... تم سن رہے ہو"

"نہیں میں نومی نہیں ہوں" کامران کی آواز ابھری۔

"اوہو، آواز نیچی رکھو.... منو، جاگ جاؤ.... ہم خطرے میں ہیں.... تین لمبے چوڑے آدمی اندر داخل ہوئے ہیں...." سلمان کی خوف میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

"میں بھی نومی نہیں ہوں" اس بار مریم کی آواز سنائی دی۔

"حد ہو گئی.... اب اندھیرے میں اندازے کی غلطی ہو ہی سکتی ہے.... بہر حال.... تینوں سن لو.... اندر تین آدمی داخل ہوئے ہیں.... پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی.... اب بھی اگر تمہارے کانوں پر جوں نہ رینگی تو میں تنہا کچھ کر بیٹھوں گا"۔

"کک.... کیا کر بیٹھو گے" مریم کی آواز سرسرائی۔

"پپ.... پتا نہیں.... لیکن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھوں گا"۔

"بھئی نومی.... تو سنجیدہ لگتا ہے.... میرا مطلب ہے.... آج یہ مذاق کے موڈ میں نہیں ہے" کامران بولا۔

"کک.... کیا واقعی" نومی کی آواز میں اب گھبراہٹ شامل ہو گئی۔

"ہاں! میں مذاق نہیں کر رہا"۔

"ارے باپ رے" وہ ایک ساتھ بولے اور بستروں پر اچھل کر اٹھ بیٹھے۔

"تب پھر کیا کریں" مریم نے سرگوشی کی۔

"ابا جان اور امی جان کو جگا دیتے ہیں" نعمان نے کہا۔

"جگا تو تب دیں نا جب ہم ان کی نظروں میں آئے بغیر وہاں تک جا سکیں.... وہ غالباً اس وقت صحن میں ہیں" سلمان نے شاید برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ایک منٹ ٹھہرو.... پہلے میں دیکھ لوں..... وہ اس وقت کہاں ہیں"۔ یہ کہہ کر سلمان نے دروازے میں تھوڑی سی جھری بنائی اور باہر جھانکا.... باقی بھی جھری کے نزدیک ہو گئے۔ صحن میں زیرو کا بلب روشن تھا.... لہٰذا انہوں نے ان تینوں کو سامنے دیکھا.... وہ بھی آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے.... شاید یہ کھسر پھسر کسی مشورے کے سلسلے میں ہو رہی تھی۔

اچانک ان کا رخ ایک کمرے کی طرف ہو گیا، یہ دیکھ کر وہ چونک اٹھے۔ "وہ.... وہ ابو کے کمرے کی طرف جا رہے ہیں" سلمان نے کہا۔

"ارے باپ رے"۔

"لیکن.... ابو کے کمرے میں اس وقت ابو نہیں ہیں.... وہ تو ان کا صرف لکھنے پڑھنے کا کمرا ہے.... اور امی ابو تو اس وقت بیڈ روم میں گہری نیند کے مزے لے رہے ہوں گے"۔

"اور وہ.... وہ کمرے میں داخل ہو گئے" سلمان نے گویا خبر دی۔

"تب تو.... موقع اچھا ہے" نعمان نے فوراً کہا۔

"کک.... کون سا موقع؟" مریم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ایک منٹ.... میں ابھی آیا۔ تم لوگ کمرے سے نہ نکلنا.... خبردار" سلمان نے کہا"۔

"اوپر.... آخر تم کیا کرنے جا رہے ہو؟" کامران نے بھنا کر کہا"۔

"بس.... دیکھتے جاؤ...." سلمان کی آواز سنائی دی۔

"دیکھتے کیا جائیں.... اندر کمرے میں اندھیرا ہے...." مریم نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"حد ہو گئی" سلمان نے بھنا کر کہا اور کمرے سے نکل گیا.... وہ جھری میں نظریں جمائے کھڑے رہے۔ ان کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے اور حلق خشک ہوتے چلے جا رہے تھے... اور موسم شدید سردی کا تھا.... انہوں نے سلمان کو اس کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔

"پپ.... پتا نہیں.... یہ حضرت کیا کرنا چاہتے ہیں.... بس ہر وقت ہیرو بننے کا بھوت سوار رہتا ہے" مریم کو آواز سنائی دی۔

"بھئی پہلے دیکھ لو وہ کرنا کیا چاہتا ہے" کامران ہلکی سی آواز میں بولا۔

اچانک انہوں نے سلمان کو واپس آتے دیکھا.... کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دبی آواز میں کہا۔

"میں میدان مار کر آیا ہوں"

"ہیں.... کیا واقعی.... مم.... مگر ہمارے گھر میں میدان کہاں سے آگیا؟" نعمان بول اٹھا۔

"چپ.... میں انہیں کمرے میں بند کر آیا ہوں۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر ڈالا ہے"

"اوہ.... اوہ.... واہ" ان کے منہ سے نکلا۔

"بہت خوب مزا آگیا.... آؤ پھر جلدی.... اب تو ہم ابو امی کو جگا ہی سکتے ہیں"۔

"ہاں ضرور.... کیوں نہیں"۔

وہ تیزی سے باہر نکلے اور بیڈ روم کے دروازے پر ٹھک ٹھک.... ٹھک ٹھک شروع کر دی۔ آخر ان کے والد کو ان کی آواز سنائی دی۔

"کیا ہے.... رات کو بھی چین نہیں تمہیں.... رات کا ایک بج رہا ہے"۔

"جی.... جی.... وہ.... وہ تین آدمی"۔

"وہ.... وہ.... تین آدمی.... کیا اس کی انگریزی پوچھنا چاہتے ہو...." ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی نہیں.... گھر میں تین آدمی داخل ہوئے ہیں" سلمان نے دبی آواز میں کہا۔

"کب.... نہیں" ان کی آواز میں کپ کپی انہوں نے صاف محسوس کی۔

"ہم غلط نہیں کہہ رہے.... نہ اس وقت مذاق کے موڈ میں ہیں"۔

"ارے باپ رے.... وہ کہاں ہیں؟"

"وہ سب پہلے اندر آئے اور پھر آپ کے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں چلے گئے...."

"اوہ.... اوہ.... اللہ اپنا رحم فرمائے.... سب سے پہلے پولیس کو خبر کرنا چاہیے' انسپکٹر خالد فوراً آجائیں اللہ کرے"۔ یہ کہہ کر وہ فون کی طرف لپکے۔

"کک.... کیا ہوا.... کیا ہوا؟" انہوں نے اپنی والدہ کی آواز سنی.... شاید ان کی آنکھ پوری طرح اب کھلی تھی۔

"ایک منٹ امی جان.... ابھی بتاتے ہیں.... پہلے ابو کو فون کرنے دیں"۔

"خون.... ارے باپ.... اب پھر کسی کا خون کرنے پر اتر آئے"

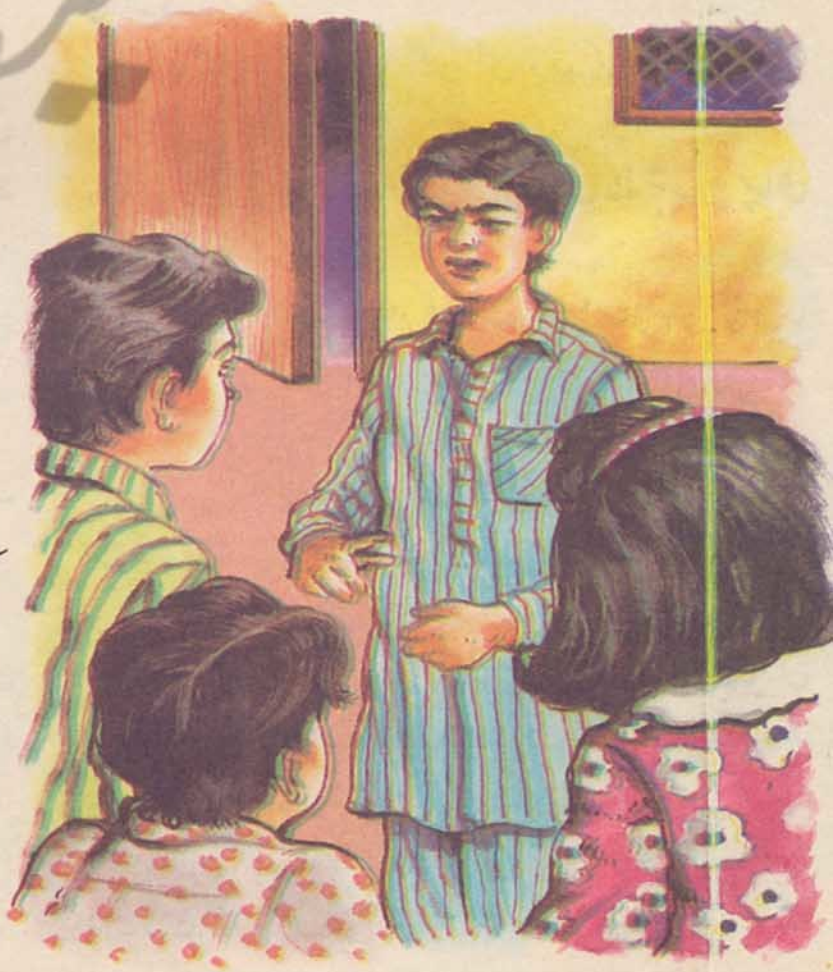

"حد ہو گئی بیگم.... گھر میں تین چور آ گئے ہیں"۔

"نن.... نہیں.... نہیں" وہ چلائیں۔

"آپ کے نن.... نہیں.... نہیں کرنے سے وہ چلے نہیں جائیں گے.... آواز بلند نہ کریں.... اول تو اب تک آپ کے چیخنے کی آواز سن چکے ہوں گے" ابو جلدی جلدی بولے۔

"اوہ.... سس.... سوری" امی جان شرمندہ ہو گئیں.... اور پھر انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

ادھر ابو جلدی جلدی نمبر دبا رہے تھے۔ پھر زور سے اچھلے.... ان کی آنکھوں میں بے پناہ خوف دوڑ گیا۔ "کک.... کیا ہوا ابا جان"

"فون بند ہے.... بالکل بند.... یا تو خراب ہو گیا ہے.... یا پھر...." وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"یا پھر کیا؟" وہ ایک ساتھ بولے۔

"یا پھر.... ان لوگوں نے فون کے تار کاٹ دیئے ہیں"۔

"کب" وہ سب دھک سے رہ گئے۔

"ہاں! اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے"۔

"تو کیا ہوا ابو.... ہم گھر سے باہر نکل سکتے ہیں اور آنٹی نیاز کے گھر سے فون کر سکتے ہیں.... آیئے اس طرح ہم ان کے ہاتھوں محفوظ رہیں گے" مریم نے جلدی جلدی کہا۔

"ترکیب معقول ہے" ابو پہلی بار مسکرائے۔

"تو پھر چلیے.... نہیں وہ دروازہ توڑ کر باہر نہ نکل آئیں" امی بولیں۔

".... یہ اتنا آسان بھی نہیں.... ہمارے دروازے بہت مضبوط ہیں"۔

"خدا کا شکر ہے" نعمان نے فوراً کہا۔

اب وہ سب بیرونی دروازے کی طرف بڑھے.... ان کے ابو نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ چٹخنی گرا کر اور ہینڈل پکڑ کر کھینچا۔ پھر ان کا ہاتھ وہیں چپک کر رہ گیا۔

"کیا ہوا.... آپ رک کیوں گئے" کامران بے تاب ہو کر بولا"۔

"دروازہ باہر سے بند ہے"۔

"کیا!!!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں! اس کا مطلب ہے.... ان کا کوئی ساتھی گھر سے باہر بھی ہے"

"ارے باپ رے.... تب تو یہ پکا انتظام کر کے اندر داخل ہوئے ہیں.... اب.... اب ہم کیا کریں؟" مریم گھبرا گئی۔

"ان لوگوں نے باقی دروازے بھی ضرور باہر سے بند کر دیئے ہیں.... پھر بھی ہمیں دروازے چیک کر لینے چاہئیں"۔

انہوں نے جلدی جلدی دروازے چیک کیے.... تمام کے تمام باہر سے بند تھے۔

"اف مالک.... اب کیا ہو گا؟" ان کے والد بولے۔

"وہی ہو گا جو خدا کو منظور ہو گا" سلمان نے فرمانبردارانہ انداز میں کہا۔

"مطلب یہ کہ ہم اپنے ہی گھر میں قید ہو چکے ہیں" ان کی والدہ نے کہا۔

"لیکن.... ہم نے انہیں بھی تو قید کر لیا ہے" نعمان مسکرایا۔

"قید کر لیا ہے.... ارے ہاں.... میں نے تو یہ پوچھا ہی نہیں کہ وہ تینوں ہیں کہاں"۔

"ان لوگوں نے بتایا تھا لیکن آپ اس وقت نیند میں تھیں"۔

"کب بتایا تھا؟"

"پہلے تو تم یہ بتاؤ سلمان.... تم نے انہیں دیکھ کیسے لیا" ان کے والد نے پوچھا۔

میں گہری نیند میں تھا اور ایک خواب.... بہت خوب صورت خواب دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے پیاس لگی ہے۔ ابھی میں دروازہ کھول کر باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ میں نے انہیں صحن میں کھڑے دیکھ لیا۔ اس کے بعد میں نے انہیں جگایا پھر ہم نے سوچا.... آپ کو جگا دیں لیکن راستے میں تو وہ کھڑے تھے۔ پھر ہم نے انہیں کمرے

کی طرف جاتے دیکھا۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئے میں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اس کے بعد ہم نے آپ کو جگایا۔ اب صورت حال گویا یہ ہے کہ وہ کمرے میں بند ہیں اور ہم گھر میں۔ وہ کمرے سے نہیں نکل سکتے تو ہم گھر سے نہیں نکل سکتے۔ اس لیے کہ گھر سے باہر بھی ان کا کوئی ساتھی موجود ہے اور فون کے تار انہوں نے کاٹ دیئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اب ہم کریں تو کیا کریں"۔

"ان سے بات کریں آخر وہ چاہتے کیا ہیں" ان کی والدہ بولیں۔

"صاف ظاہر ہے وہ چور یا ڈاکو ہیں، گھر کا مال اور دولت لوٹنا چاہتے ہیں"۔

"اللہ اپنا رحم فرمائے اب کیا ہوگا" مریم کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"آؤ میں ان سے بات کرتا ہوں" ان کے والد نے پر سکون آواز میں کہا.... شاید وہ سوچ رہے تھے کہ اگر انہوں نے پریشانی یا گھبراہٹ ظاہر کی تو بچوں کا کیا حال ہوگا۔

وہ کمرے سے نکلے ہی تھے کہ ان کی والدہ زور سے اچھلیں۔

"ارے.... نن .... نہیں.... نہیں" ان کی آواز سے زمانے بھر کا خوف جھلک رہا تھا۔

"کک.... کیا ہوا امی.... آپ کو کیا نظر آگیا"۔

انہیں اس قدر زور سے چلاتے سن کر وہ دھک سے رہ گئے۔

"بات بھی تو بتائیں بیگم"۔

"وہ.... وہ.... وہ" انہوں نے مشکل سے کہا۔

"وہ کیا" وہ بولے

"مم.... مم.... منے میاں...."

"منے میاں.... کیا ہوا منے میاں کو"۔

"وہ ہمارے کمرے میں نہیں.... شاید اپنی عادت کے مطابق وہ آپ کے لکھنے پڑھنے والے کمرے میں جا سوئے ہیں۔ جیسا کہ ان کی عادت ہے.... سونے کے لیے اکثر اس کمرے میں چلے جاتے ہیں"۔

"نن.... نہیں.... نہیں" وہ سب ایک ساتھ چلائے۔

عین اسی لمحے اس کمرے کے دروازے کو اندر سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ ان سب کا خون رگوں میں جمتا محسوس ہوا۔

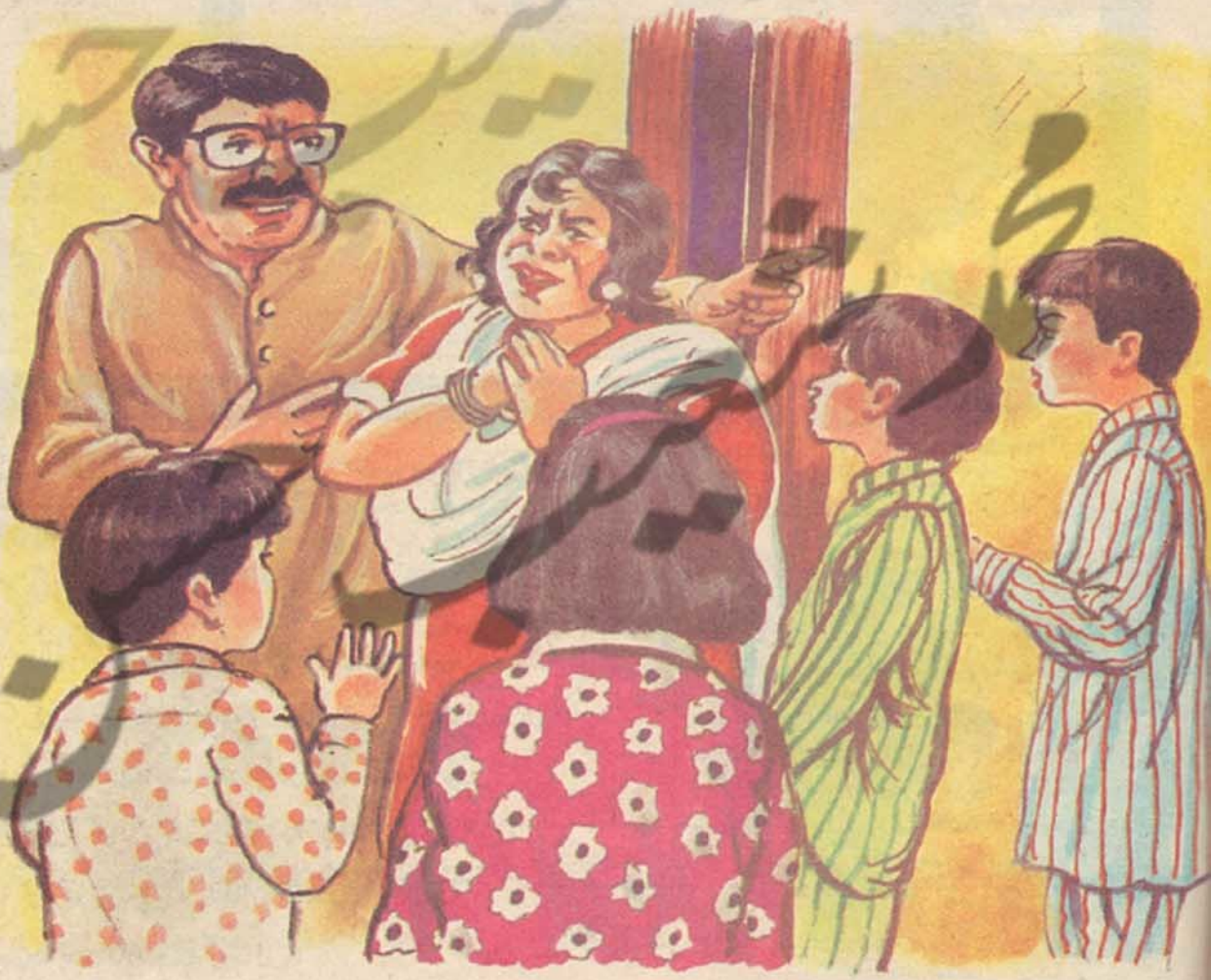

باقی آئندہ

بلاعنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 مئی 2000ء

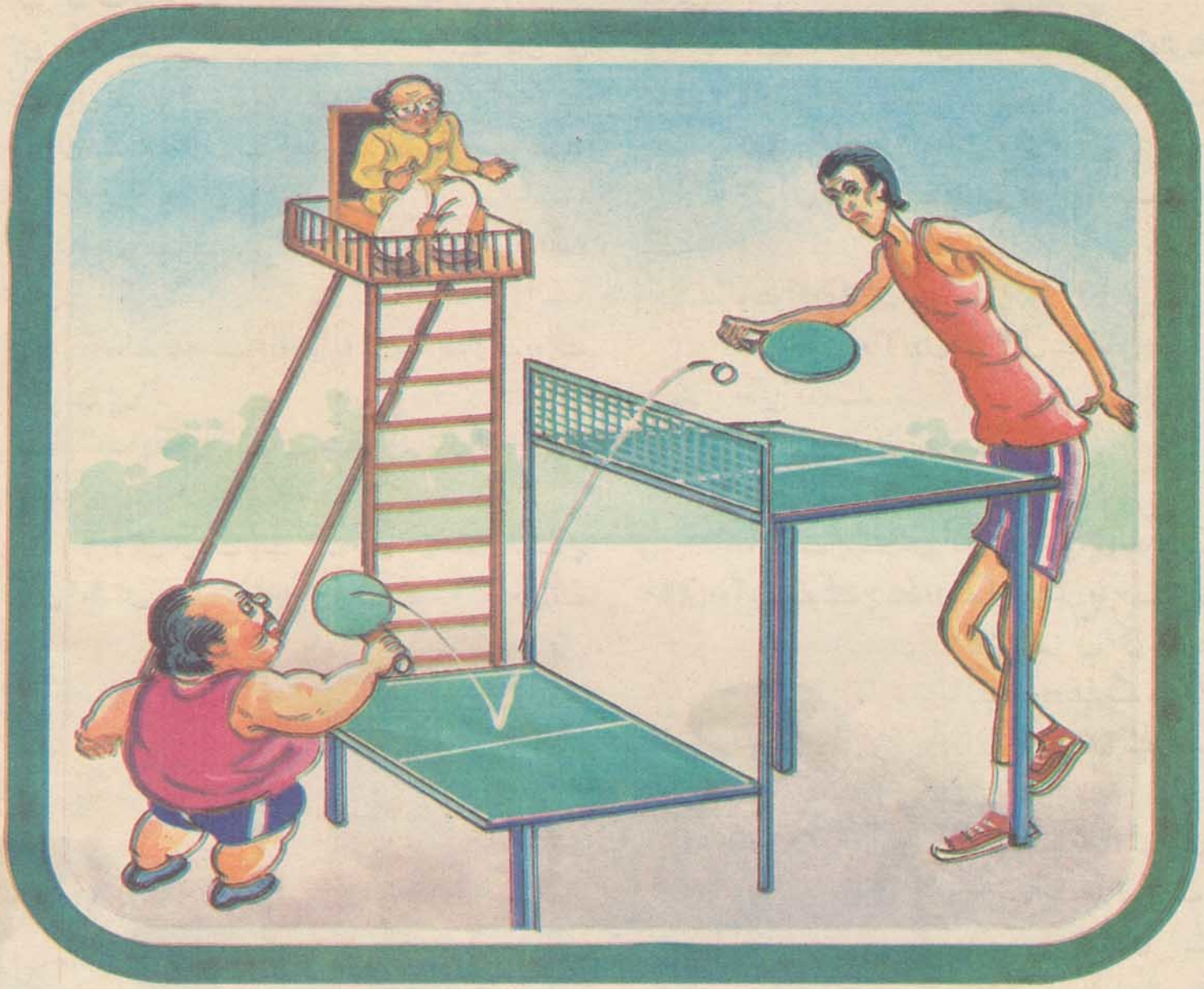

اپریل 2000ء کے بلاعنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ 6 ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

☆ احمد دانیال صدیقی، ملتان (چل میرے ہاتھی دورہ گئے ہیں باقی، پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

☆ حفصہ القائی، لاہور (منے کا جونیا ساتھی ہے، مالی ہے یا ہاتھی ہے؟ دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)

☆ اعجاز احمد، سمندری (جلدی کرو پانی ختم ہونے والا ہے، تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

☆ عقیل انجم، نارووال (اب کی شجر کاری ہاتھی کے سنگ، چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

☆ سعدیہ شہاب، لاہور (اب آیا ہاتھی ہاتھ میں، پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)

☆ کنول طاہر، پشاور (قدرتی فوارہ، چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)

قسم قسم کے لذیذ اور خوش ذائقہ

پکوان

منوّر جہاں کا دسترخوان :	سستے اور پُرتکلّف کھانے پکانے کی عام فہم ترکیبیں۔	Rs. 39.00
دیس دیس کے پکوان :	ایشیا، افریقہ، یورپ، آسٹریلیا اور امریکا کے لذیذ پکوان۔	Rs. 30.00
صبیحہ کا دسترخوان :	کم فرصت خواتین کے لیے طرح طرح کے کھانے، پڈنگ، شربت، جام اور اچار۔	Rs. 39.00
چینی کھانے :	چینی کھانوں کے شائقین کے لیے لاجواب کتاب۔	Rs. 40.00
سبزیاں پکایئے :	سبزیاں پکانے کی ترکیبیں۔ یہ کتاب منوّر جہاں کے دسترخوان سے مُرتّب کی گئی ہے۔	Rs. 30.00
گوشت پکایئے، مچھلی پکایئے :	گوشت اور مچھلی کے ہر قسم کے پکوان۔ یہ کتاب بھی منوّر جہاں کے دسترخوان سے مُرتّب کی گئی ہے۔	Rs. 50.00
میٹھے پکوان :	حلوے، زردے، کھیر، سوّیاں، انگریزی پڈنگ اور دیسی مٹھائیاں بنانے کی آسان ترکیبیں۔	Rs. 50.00

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور - راولپنڈی - کراچی

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
NO. CPL. 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

کیوں

ہم کیوں ہنستے ہیں؟ اور بہت سارے کیوں کے جواب

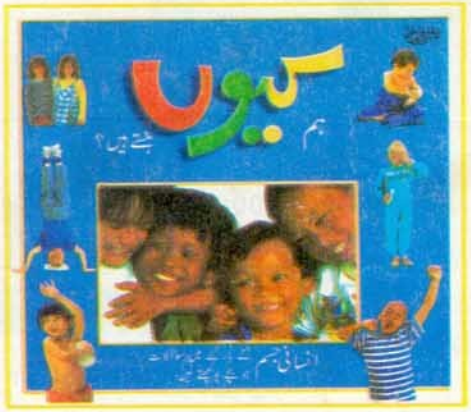

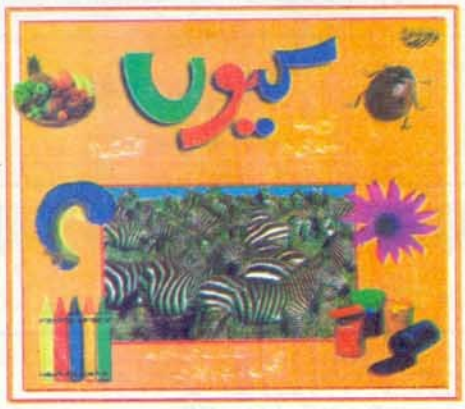

یہ کتابیں خود پڑھئے اور اپنے دوستوں کو تحفے میں دیجئے

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

ہمارے شو رومز میں آپ کے لیے اس کے
علاوہ بھی انتہائی دیدہ زیب اور مفید کتابیں ہیں۔